مالک رام

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

کچھ
ابوالکلام آزاد
کے بارے میں

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

Marfat.com

© مالک رام ۱۹۸۹

137129

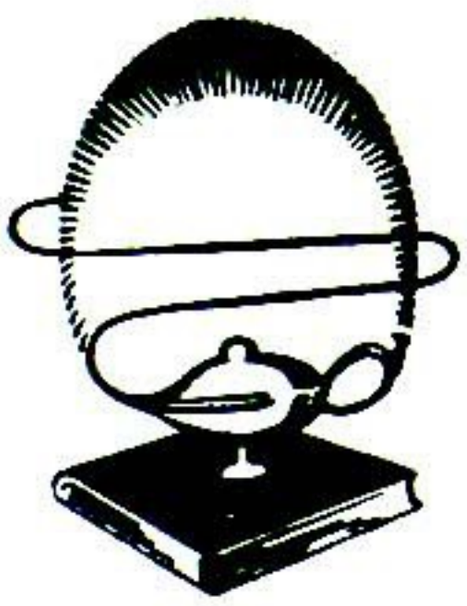

صدر دفتر :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

قیمت : 51/=

پہلی بار جون ۱۹۸۹ء

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ھاوس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

Marfat.com

پیش گفتار

۱

جون ۱۹۲۷ء میں "الہلال" کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس کا پہلا دور جولائی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک تھا۔ دوسرا، جب یہ "البلاغ" کے نام سے ۱۹۱۵-۱۹۱۶ء میں شائع ہوتا رہا۔ اور اب تیسرا جون ۱۹۲۷ء سے شروع ہوا۔ افسوس کہ یہ بھی چھ مہینے سے تجاوز نہ کر سکا۔ ۹ دسمبر کا پرچہ اس کا آخری شمارہ ثابت ہوا:

خوش درخشید، ولے دولتِ مستعجل بود

اس دور میں خود مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے بہت کم مضامین شامل اشاعت ہوئے۔ بیشتر کام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کا تھا۔ مولانا آزاد اب کانگریس کے ممتاز اور معروف ترین لیڈروں میں سے تھے۔ کانگریس اور تحریک خلافت کے سلسلے میں وہ زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ظاہر ہے، ایسے میں ایک ہفتہ وار پرچے کے لیے کچھ مہلت کی فرصت کہاں میسر آسکتی تھی!

میں ۱۹۲۶ء میں لاہور آ گیا تھا۔ یہاں میں نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ الہلال جاری ہوا، تو میں نے ان چھ مہینوں کے تمام شمارے تو لیے ہی۔ اس کے علاوہ جب ایک پرچے میں اشتہار شائع ہوا کہ پہلے دور کے پرچے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں، تو میں نے مطلوبہ رقم بھیج کر وہ بھی منگوا لیے۔

Marfat.com

اور یوں اس کا پورا فائل میری نظر سے گذر گیا۔

اس سے پہلے مجھے اِدھر اُدھر مولانا آزاد کی صرف چند متفرق تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس ششماہی میں "الہلال" کے تازہ اور پرانے پرچے دیکھنے پر انھیں بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا۔ آج جب اس بات پر ۶۲ - ۶۳ برس گذر چکے ہیں، میرے لیے یہ محال ہے کہ مَیں اپنے جذبات اور خیالات ٹھیک ٹھیک بیان کر سکوں، جو اس وقت میرے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ گزشتہ چار پانچ برس سے "نگار" باقاعدہ میری نظر سے گزرتا رہا تھا۔ اس لیے مَیں زبان کی ثقالت اور فارسی عربی کی بھاری بھرکم ترکیبوں سے بہت حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ مَیں نے اسلامیات اور بالخصوص قرآن کا مطالعہ بھی اپنے ہائی اسکول کے دَور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ مَیں عربی سے نابلد تھا، لیکن اپنی ابتدائی فارسی تعلیم کے بل بُوتے پر مَیں "الہلال" کے دورِ اوّل کے مضامین سے بہت محظوظ، بلکہ مستفید اور مستفیض ہوا۔ ان کا مسائل پر نئے انداز اور استدلال سے خطیبانہ اسلوب میں لکھنا سحر سے کم نہیں تھا۔

مَیں اس سے قبل نیاز فتحپوری سے متاثر تھا۔ مولانا آزاد کی ان تحریروں نے وہ اثر گویا دوآتشہ کر دیا۔ اور مَیں اپنی تحریروں میں قصداً ان کا تتبع کرنے لگا۔ چنانچہ میرے ابتدائی مضامین میں یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ الحمدللہ مَیں جلد ہی اس سے آزاد ہو گیا۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے۔

یہاں ایک جملۂ معترضہ غالباً بیمحل نہیں ہوگا۔

"الہلال" (خصوصاً دورِ اوّل) دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نیاز فتحپوری نے مولانا آزاد کے تتبع اور تقلید کی شعوری کوشش کی ہے۔ 'الہلال' کے اس ابتدائی دَور میں نیاز کا کلام بھی نظر سے گزرا جس سے اس بات کی مزید شہادت مہیا ہوئی کہ نیاز "الہلال" کے باقاعدہ قاری اور اس کے مداح تھے۔

۲

میں لا کالج، لاہور کا طالب علم تھا کہ ۱۹۳۱ء کے اواخر (بلکہ ۱۹۳۲ء کے اوائل) میں "ترجمان القرآن"

Marfat.com

کی پہلی جلد لاہور پہنچی۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ یہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ کہاں "الہلال" کی خطابت اور لغت سازی، اور کہاں "ترجمان القرآن" کی دلنشیں سبک روی اور سلاست! بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کے کم و بیش دس اُردو ترجمے ضرور دیکھے ہونگے۔ لیکن جو لطف "ترجمان القرآن" کے سادہ ترجمے میں آیا، وہ اِلاّ ماشاء اللہ اور کہیں نہیں ملا۔ یہاں کوئی ایچ پیچ نہیں۔ زبان وہی، جو سب بولتے، اور کسی لغت کی مدد کے بغیر آسانی سے سمجھتے ہیں۔ فقروں کا وہی دروبست جو اردوے معلیٰ کا اور صرف و نحو کا اقتضا ہے۔ کہیں رکنے یا سر کھجلانے کی ضرورت نہیں۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایسی برجستہ اور مدلّل مفصّل اور علومِ جدید پر حاوی ہے کہ باید و شاید۔ سورۂ فاتحہ اُم الکتاب کہلاتی ہے، اور اس میں پورے قرآن اور اسلام کی تعلیم کی روح آگئی ہے لیکن اگر کسی نے مولانا آزاد کی تفسیرِ سورۂ فاتحہ نہیں دیکھی، تو اسے معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ "روح" ہے کیا! اس تفسیر سے جہاں قرآنی تعلیم کی ہمہ گیری، اس کی بلاغتِ زبان اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس سے خود مولانا آزاد کے تبحّر اور ژرف نگاہی، مسائل کے ادراک و فہم اور اپنے علم کے نتائج کے ابلاغ کی قدرت پر بھی برہانِ قاطع مہیا ہوتی ہے۔ فجزاہ اللہ و احسن الجزاء۔

اسی زمانے میں "ترجمان القرآن" ہی سے متعلق مجھے دو تین خط بھی مولانا آزاد کی خدمت میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔

۳

۱۹۳۹ء کے شروع میں حکومتِ ہند نے دنیا کے بعض ممالک میں تجارتی دفتر قائم کیے تھے۔ ان میں ایک دفتر مصر میں اسکندریہ کے مقام پر تھا۔ اس کے لیے میرا انتخاب ہوا۔ اور حکم ملا کہ مصر جانے سے پہلے تمھیں تین مہینے کلکتہ کے دفتر میں ٹریننگ حاصل کرنا ہوگی۔ میں ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کی صبح کلکتے پہنچا۔ دلّی سے روانگی سے قبل یہاں سے ایک دوست نے سنٹرل ہوٹل (چترنجن ایونیو) کے منیجر کو خط لکھ دیا تھا۔ چنانچہ میں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ہوٹل گیا، اور وہاں ایک کمرہ کرایے پر لے کر سامان کھول دیا۔ اگلے دن یکم اپریل کو ڈلہوزی اسکوائر اپنے دفتر

Marfat.com

حاضر ہوگیا۔
اتفاق سے اس سے اگلے ہی دن اتوار تھا۔ مَیں نے صبح کے ناشتے کے بعد بالی گنج میں مولانا آزاد کے مکان کی راہ لی :

بلاکشانِ محبت بکوے یار روند

مَیں کوئی دس بجے وہاں پہنچا ہونگا۔ عین سڑک کے کنارے بڑی کشادہ کوٹھی تھی۔ چاروں طرف وسیع صحن کے درمیان رہائشی مکان تھا۔ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی الٹے ہاتھ ایک کمرہ تھا، اس میں محمد اجمل خان صاحب سے ملاقات ہوئی جو سال بھر پہلے (۱۹۳۸ء) مولانا کے سکرٹر متقرر ہوئے تھے۔ مَیں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت مولانا کے سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ نام پوچھا، کام پوچھا، مقام پوچھا۔ مَیں نے بتایا کہ میری ان سے پہلے کی ملاقات نہیں ہے، اور محض زیارت مقصود ہے۔ نہ معلوم، انھیں صبح سے شام تک ایسے کتنے زائرین سے واسطہ پڑتا ہوگا۔ فرمایا : آپ اپنا نام اور پتا لکھ دیجیے، میں مولانا سے دریافت کرنے کے بعد آپ کو مطلع کر دونگا۔ مَیں نے تعمیلِ حکم میں ضروری کوائف لکھ دیے، اور اتنا زبانی کہا کہ مَیں ایک دفتر میں کام کرتا ہوں، جہاں چھٹی صرف اتوار کے دن ہوتی ہے۔ اس لیے ممنون ہونگا اگر ملاقات کسی اتوار کی مقرر کی جائے۔ دوسرے یہ کہ کلکتے میں میرا قیام صرف تین مہینے کا ہے۔
مَیں اٹھنے لگا، تو نہ معلوم، کس بات سے ان کا دل پسیجا۔ فرمایا : دو منٹ رک جائیے۔ مَیں ابھی جاکر ان سے دریافت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ دو تین منٹ بعد واپس آئے اور فرمایا کہ آپ اندر جاسکتے ہیں، وہ ابھی آپ سے مل لینگے۔ اور اشارہ کرکے بتایا کہ سامنے زینہ ہے، اس پر سے اوپر جائیے، برآمدے میں سیدھے ہاتھ سامنے کا پہلا کمرہ ہے۔ مَیں صحن طے کرکے زینے تک پہنچا۔ کوٹھی کی کرسی اونچی تھی۔ تین چار سیڑھیاں اوپر جاکر برآمدے میں داخل ہوا۔ محمد اجمل خان صاحب کے بتائے ہوئے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مَیں ٹھٹکا ہی تھا کہ اندر سے آواز آئی : "تشریف لائیے"۔
مَیں داخل ہوگیا۔
متوسط سائز کا (۱۵ × ۱۵ فٹ) مربع کمرہ ہوگا۔ بائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا پلنگ بچھا تھا۔ اس کے برابر میں تپائی پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ دو خالی کرسیاں تھیں۔ کمرے کے کونے میں چھوٹی

Marfat.com

تپائی پر جگ میں پانی اور ایک گلاس۔ مولانا خود اس پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، پانو پھیلائے نیم دراز لیٹے یا بیٹھے تھے۔ وہ اس سے چند دن پہلے (۱۴ مارچ) الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر کیلے کے چھلکے پر پانو پڑ جانے سے پھسلے اور گر گئے تھے، جس سے ان کی الٹی ایڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ گھٹنے کی چپنی بھی اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ اسی باعث وہ پورا وقت بستر پر گزارنے پر مجبور تھے۔ ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، اور اس پر سفید چادر پڑی تھی۔

مَیں نے اس سے قبل صرف ایک مرتبہ انھیں لاہور میں دیکھا تھا۔

غالباً ۱۹۲۷ء کے اواخر کی بات ہے، سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کی ہندستان میں آمد کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ بیشتر سیاسی حلقے اس پر سخت ناراض، بلکہ برافروختہ تھے کہ کمیشن میں کوئی ہندستانی نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے اکثر جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لاہور کے سر محمد شفیع اور ان کے ہمنوا بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ لاہور میں جلسہ ہوا، جس کا مقصد حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج اور لوگوں کو کمیشن کے بائیکاٹ کی ترغیب دلانا تھا۔ جلسہ غالباً موچی دروازے ــــ (یا شاید بھاٹی دروازے) کے باہر کمیٹی باغ میں ہوا تھا۔ اسٹیج پر منجملہ اور اصحاب کے مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم نے اسلام کی تعلیم ان دونوں بزرگوں ــــــ اقبال اور آزاد ــــــ سے پائی۔ آج ایک ہمیں کمیشن سے تعاون کی تلقین کر رہے ہیں اور دوسرے اس کے بائیکاٹ کی۔ ہم عجب گومگو میں ہیں کہ کس کا تتبع کریں۔ (اس میں اشارہ اقبال کی فارسی مثنویات (اسرار و رموز) اور مولانا آزاد کے ہفتہ وار الہلال کی طرف تھا)

مَیں نے اپنا تعارف کرایا۔ انھیں ہماری "ترجمان القرآن" کے سلسلے کی خط و کتابت یاد آ گئی۔ مَیں کوئی گھنٹہ بھر ٹھہرا۔ میری تعلیم اور علمی ادبی تربیت اور ترغیبات اور سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ مَیں نے اس دوران میں جو چند مضامین لکھے تھے، ان سے متعلق سن کر خوشی کا اظہار کیا اور حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ غرض، گھنٹہ ڈیڑھ دلچسپ گفتگو میں نکل گیا۔ اور علوم بھی نہ ہوا کہ ہم اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں۔

جب مَیں نے اجازت چاہی، تو دریافت فرمایا کہ کلکتے میں کب تک قیام رہیگا؟ مَیں نے بتایا کہ تین

Marfat.com

مہینے، جُون کے اواخر تک؛ اس کے بعد مصر جانے کی تیاری ہے۔ حکم دیا کہ جتنے دن کلکتہ میں ہو، اتوار، تعطیل کے دن تو لازماً بلا ناغہ آؤ، اور اگر ہفتے کے دوران میں بھی کوئی چھٹی آپڑے تو آسکتا ہوں۔ مَیں شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

مَیں نے ان تین مہینوں میں کوئی اتوار ناغہ نہیں کیا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مجھے اتوار کا انتظار رہنے لگا — ان ہفتہ واری ملاقاتوں میں مذہب، ادب، سیاست ——— غرض دُنیا بھر کے گوناگوں موضوعات پر ان سے خوب خوب باتیں ہوئیں۔ مَیں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سے مجھے کتنا فائدہ ہوا۔ مَیں نے اپنی بساط بھر بہت پڑھا تھا۔ اُردو اور فارسی میں بہت کچھ میری نظر سے گزر چکا تھا۔ اور عربی میں بھی کچھ شُدبُد حاصل تھی۔ لیکن اُن کے مطالعے کی وسعت اور بوقلمونی اور استحضار اور "گل افشانی گفتار" کا صحیح اندازہ اُس وقت تک محال تھا، جب تک کوئی شخص ان کے پاس نہ بیٹھے اور کسی موضوع پر ان سے گفتگو نہ کرے۔

مجھے افسوس ہے تو اس بات کا کہ مَیں نے کبھی ڈائری نہیں رکھی، نہ کبھی مجھے یادداشتیں رکھنے کی عادت رہی ہے۔ ورنہ یہ ملاقاتیں اتنی یادگار اور قیمتی تھیں، اور اُس زمانے میں اتنے مختلف مضامین اور موضوعات پر اُن سے مفصّل گفتگو رہی کہ اگر وہ قلمبند ہو گئی ہوتیں، تو جانے، کیا کچھ محفوظ ہو گیا ہوتا۔ لیکن اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے!

مَیں یکم جولائی کو رخصتی ملاقات کے لیے حاضرِ خدمت ہوا۔ فرمایا کہ آپ مصر جا رہے ہیں وہاں عربی سیکھیے اور اس کی تکمیل کیجیے۔ اُس زبان میں بے انتہا قیمتی سرمایۂ علم و ادب ہے۔ پھر ایک کاغذ کے پرزے پر تین کتابوں کے نام لکھے، اور یہ کہتے ہوئے اسے میرے ہاتھ میں دے دیا کہ سب سے پہلے یہ تین کتابیں مطالعہ کرنا چاہییں۔ یہ کتابیں تھیں: (۱) ادب الکاتب (ابن قتیبہ)؛ (۲) فقہ اللغۃ (ثعالبی)؛ (۳) کلیلہ و دمنہ۔

۴

مَیں خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی سے پی اینڈ او کمپنی کے بحری جہاز "راولپنڈی" سے روانہ ہوا۔ ہم ۳۱ جولائی صبح کے وقت پورٹ سعید اُترے۔ اور اُسی

Marfat.com

شام ریل سے اسکندریہ وارد ہوئے۔ اگلی صبح یکم اگست میں اپنے دفتر میں حاضر ہوگیا۔ ایک مہینا بعد، یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

میں جب یہاں سے چلا ہوں، تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ تمھیں تین برس تک مصر میں قیام کرنا پڑیگا۔ لیکن جنگ شروع ہو جانے کے بعد لیبیا اور مصر کا علاقہ جنگ کا اکھاڑا بن گیا۔ اٹلی اور جرمنی نے اپنی فوجیں لیبیا میں اُتار دیں۔ اُن کا ارادہ مصر پر چڑھائی کا اور اس رستے سے ہندستان پہنچنے کا تھا۔ اس فوج کی کمان آزمودہ کار جرمن جرنیل رومیلؔ ROMMELL کے ہاتھ میں تھی۔

ادھر انگریزی (اتحادی) فوجیں قاہرہ میں اہرام کے سایے میں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔ کئی مرتبہ اطالوی اور جرمن فوجیں یلغار کرتی مصر کی سرحد طبروق تک پہنچ گئیں اور پھر انگریزوں نے انھیں واپس ڈھکیل دیا۔

انگریزی فوج میں ہندستانیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اسکندریہ رستے میں تھا۔ اس پر بندرگاہ ہونے کے سبب، قاہرہ کے مقابلے میں، وہاں کی آب وہوا بہت معتدل اور خوشگوار تھی۔ اسی لیے فوجیوں کی تفریح اور چھٹی گزارنے کے لیے شہر کے مضافات میں خاص کیمپ قائم کیا گیا تھا، جہاں مسلسل ہندستانی فوجی اور افسر آتے جاتے رہتے۔ روزانہ کسی نہ کسی افسر سے ملاقات ہوتی اور اس سے جنگ کی تازہ ترین خبریں ملتی رہتیں۔ غرض عجیب کشمکش اور جوش وخروش کے دن تھے۔ یہ تشویشناک صورتِ حال کئی برس تک قائم رہی۔

ظاہر ہے ان خطرناک حالات میں یہاں ہندستان سے کوئی دوسرا شخص میری جگہ مصر جانے کے لیے کیوں تیار ہونے لگا تھا۔ یوں میں سات برس تک وہاں سے نہ نکل سکا۔ اور ۱۹۳۹ء کا گیا، کہیں دسمبر ۱۹۴۶ء میں تین مہینے کی رخصت پر وطن لوٹا۔ ہفتہ بھر پنجاب میں (بھالیہ) اپنے گاؤں رہ کر میں، ۱۹۴۷ء کے اوائل میں دلّی پہنچا۔

مولانا آزاد اب ہندستان کی مرکزی حکومت میں وزیرِ تعلیم تھے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے اگلی صبح ان کے دفتر ٹیلیفون کیا۔ ان کے سکرٹر نے حسبِ معمول نام پوچھا۔ میں نے بتایا تو دریافت کیا کہ کیا کام ہے؟ میں نے کہا: کام وام کچھ نہیں، صرف سلام کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ میرا نام لیجیے، وہ اگر حاضری کی اجازت دے دیں، مجھے اس سے مطلع کر دیجیے۔ کوئی آدھے

Marfat.com

گھنٹے میں انھوں نے اطلاع دی کہ کل صبح ساڑھے دس بجے دفتر میں آجائیے پھر بتایا کہ نارتھ بلاک میں کمرہ نمبر ۱۵۴ (؟) ہے ——— بڑے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد سیدھے ہاتھ برآمدے کا آخری کمرہ۔

مَیں اگلے دن حسب الحکم وقتِ مقررہ پر حاضر ہوگیا۔ دروازے پر کھڑے چپراسی کو مَیں نے بتایا کہ مجھے ساڑھے دس بجے بلایا ہے، اور اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے واپس آکر دروازہ کھولا، اور مجھ سے اندر جانے کو کہا۔ جب مَیں کمرے میں داخل ہوا ہوں، تو پروفیسر ہمایوں کبیر ان کے بائیں ہاتھ کھڑے کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مولانا نے ان سے کہا: اچھا، اس پر غور کرنے کے لیے بعد کو آجائیے۔ اس پر پروفیسر صاحب موصوف کمرے سے باہر چلے گئے، اور خود انھوں نے کرسی پر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مَیں لپک کر ان کے قریب پہنچ گیا اور عرض کیا کہ تشریف رکھیے۔ مسکرا کر مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میرے بیٹھتے ہی، ان کا پہلا سوال اس گفتگو کے تسلسل میں تھا، جہاں ساڑھے سات برس قبل ہم نے کلکتے میں (میری آخری الوداعی ملاقات کے دن) چھوڑی تھی۔ گویا یہ طویل وقفہ ایک لمحے میں غائب ہوگیا۔ زمان و مکان کا یہ تصوّر صرف مولانا آزاد ہی کے لیے ممکن تھا۔

مَیں ان کی منصبی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں سے ناواقف نہیں تھا۔ خود انھوں نے بھی فرمایا۔ مکان پر آئیے؛ ذرا اطمینان سے مصر کی باتیں ہونگی ۔ ۲۰ - ۲۵ منٹ کے بعد مَیں نے اجازت چاہی۔ دو تین دن بعد ان کے مسکن (۴، کنگ ایڈورڈ روڈ) پر حاضر ہوا۔ دیر تک مصر، وہاں کی زبان، تعلیم، طریقۂ تعلیم وغیرہ سے متعلق گفتگو رہی۔ دلّی کے اس قیام کے دوران میں مجھے ان سے زیادہ ملاقات کا موقع نہیں ملا، صرف دو تین مرتبہ سلام کے لیے حاضر ہوا۔ مَیں لمبی غیر حاضری کے بعد وطن آیا تھا۔ رشتہ داروں اور دوست احباب کا شدید اصرار تھا کہ مَیں ان سے جلد ملاقات کروں۔ اس کے لیے مجھے لکھنؤ، بھوپال، جالندھر، بنارس وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔

بہرحال مَیں رخصت ختم ہونے پر مارچ ۱۹۴۷ء میں مصر واپس چلا گیا۔

۵

اب کا گیا مَیں کہیں ۱۹۵۲ء کے شروع میں پھر دو مہینے کی رخصت پر ہندستان آیا۔ میرے یہ پانچ برس

Marfat.com

مِصر اور عراق میں بسر ہوئے تھے۔ اس اثنا کا سب سے اہم واقعہ ملک کی آزادی اور تقسیم، اور پاکستان کا وجود میں آنا تھا۔ میرے حکومتِ ہند کے بیشتر احباب کراچی پہنچ چکے تھے۔ جی میں آئی کہ ان سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ مَیں نے قصداً ایسے بحری جہاز سے سفر کیا، جو تین دن کے لیے کراچی رُکتا تھا۔ عدن سے مَیں نے کراچی اور لاہور کے احباب کو تار سے اطلاع دے دی کہ مَیں فلاں دن کراچی پہنچوں گا۔ چنانچہ لاہور سے مولانا غلام رسول مہر کراچی آ گئے تھے۔

یہ تین دن خوب دھما چوکڑی رہی۔ پیر حسام الدین راشدی نے ایک شام ۳۰-۴ دوستوں کو کھانے پر جمع کر لیا۔ کھانے کے بعد قوّالی کی محفل بھی گرم ہوئی۔ مَیں حضرت پیر پگاڑو کو وہیں ملا (غالباً ان کی راشدی مرحوم سے کچھ خاندانی رشتے داری بھی ہے) ماہر القادری سے پہلی ملاقات بھی اسی دن ہوئی۔ ماہر صاحب اپنے ساتھ "فاران" کے دو تین برسوں کے شماروں کا پلندہ لیتے آئے تھے، یہ انھوں نے تحفتاً دیا۔ ایک شمارہ (غالباً مئی ۱۹۵۱ء کا) الگ سے دیتے ہوئے کہا: اس میں ایک مضمون خاص طور پر آپ کے دیکھنے کا ہے۔

مَیں نے قوّالی کے دوران ہی میں وہیں بیٹھے بیٹھے دس پندرہ منٹ میں اس شمارے کی ورق گردانی کر لی۔ اس مضمون کا عنوان تھا: "پردہ اٹھتا ہے" اور یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف تھا۔ اس میں ان کے وطن اور تعلیم اور خاندان اور سفروں وغیرہ کے بارے میں سخت معاندانہ تنقید تھی۔ اس کے عنوان ہی سے اس کے لب و لہجہ کی زہرناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگلی صبح مَیں نے اس کا مولانا غلام رسول مہر سے ذکر کیا۔ وہ بھی یہ مضمون دیکھ چکے تھے۔ صرف اتنا کہا: ہاں، بھائی! یہ دن بھی دیکھنا تھے۔ خدا کی شان! آج ماہر صاحب کو بھی مولانا آزاد پر تنقید، بلکہ تنقیص کی جرأت ہوئی۔ تفو بر تو، اے چرخِ گرداں! تفو۔

ماہر القادری مرحوم، خدا معلوم کیوں، مولانا آزاد کے شدید مخالف تھے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ یہاں سے کچھ ایسے اہلِ اثر اصحاب پاکستان پہنچ گئے، جو مولانا آزاد کے ذاتی مخالف تھے۔ ان میں اتنی جرأت تو نہیں تھی کہ کھُل کر برملا اپنی مخالفت کا اظہار کریں، لیکن نجی مجلسوں میں اور اپنے ہم خیال احباب سے خط و کتابت میں وہ زہر اگلتے رہتے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یہ حجاب بہت حد تک اٹھ گیا، اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ ماہر صاحب کی

Marfat.com

ان میں سے ایک بزرگوار سے ملاقات ہوئی۔ دونوں ہمخیال (بلکہ ہم مقصد) تو تھے ہی، بس پھر کیا تھا: خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے "فرزانے" دو۔ اب ماہر صاحب نے "فاران" میں کبھی کنایے سے، کبھی صراحت سے مولانا آزاد کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ ان کا یہ ۱۹۵۱ء کا مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

میں یہاں دلّی پہنچا، تو حسبِ معمول مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں مجھے اس مضمون کا خیال آیا۔ مَیں نے کہا، مجھے کچھ معلومات درکار ہیں، مَیں ایک مضمون کا جواب لکھنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے تفصیل بتائی، تو اس پر انھوں نے جو کچھ کہا، وہ میرا زندگی کے لیے رہنما اصول بن گیا۔ فرمایا:

> کیا آپ کے پاس کرنے کو کوئی اور کام نہیں کہ آپ کو لوگوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی سُوجھی ہے۔ یہ بالکل فضول اور بیکار کام ہے۔ اگر معترض نے کوئی صحیح بات لکھی ہے تو اپنی اصلاح کر لیجیے۔ اور اگر غلط لکھا ہے تو اس سے درگزر کیجیے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور تلخی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس سے جو وقت بچے گا اس میں کوئی اور مفید کام کیجیے۔

بہرحال انھوں نے جواب لکھنے سے سختی سے منع کر دیا۔ اور مَیں نے ان سے اتفاق کر لیا۔

مَیں اس سفر میں اپنی بیوی اور بڑے بیٹے کے ساتھ آیا تھا۔ باقی خاندان وہیں مصر میں والدہ کے پاس تھا۔ تھوڑے دن بعد تار ملا کہ بچّوں میں سے ایک سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اس لیے مَیں رخصت کی مقرّرہ میعاد منقطع کر کے واپس چلا گیا۔

۶

اپنی مرکزی حکومت کی ۲۵، ۲۶ سالہ ملازمت کے دوران میں مجھے یہاں دلّی میں صرف تین چار برس رہنے کا اتفاق ہوا، ورنہ ساری مدّت بیرونِ ملک کی ہنگامہ گردی میں بسر ہوئی۔ یہاں قیام کا سب سے لمبا زمانہ ۱۹۵۵ - ۱۹۵۸ء کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلکتے کے بعد مجھے ان کی خدمت میں بارہا حاضر ہونے اور مختلف موضوعات پر طویل گفتگو اور استفادے کا موقع ملا۔ الحمدللہ

Marfat.com

مَیں نومبر ۱۹۵۴ء میں بمبئی پہنچا تھا۔ مہینا بھر وہاں خاندان کے ساتھ گزارا اور دسمبر کے اواخر میں دِلی آیا۔ حسبِ معمول یہاں پہنچنے کے بعد مَیں پہلی فرصت میں کوٹھی (۴، کنگ ایڈورڈ روڈ) پر حاضر ہوا۔ اس مرتبہ ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔

قدرتاً پہلے محمد اجمل خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے ملے۔ فرمایا: آج کل بہت مصروف ہیں۔ دیکھیے، مَیں اُن سے دریافت کرکے آپ کو مطلع کرونگا۔ مَیں خاموش واپس چلا آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ محمد اجمل خان مرحوم کچھ عجیب اِکل کھرّے مزاج کے بزرگ تھے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو کوئی شخص مولانا سے نہ مل سکتا۔ بہرحال ہفتہ عشرہ گزر گیا۔ چند دن بعد مَیں کسی تقریب میں ایک جگہ گیا۔ مولانا آزاد بھی اس میں موجود تھے۔ وہ ایک طرف جا رہے تھے کہ انھوں نے مجھے دیکھا۔ ٹھٹک کر رُک گئے۔ مَیں فوراً بڑھ کر خدمت میں حاضر ہوا اور جھک کر آداب بجا لایا۔ پوچھا: آپ کب آئے؟ مَیں نے عرض کیا: دس بارہ دن ہوئے۔ اس پر تعجب کے لہجے میں دُہرایا: دس بارہ دن! مَیں سمجھ گیا۔ فوراً جواب دیا کہ مَیں آتے کے ساتھ ہی مکان پر سلام کو حاضر ہوا تھا لیکن محمد اجمل خان صاحب نے بتایا کہ آپ ان دنوں بیحد مصروف ہیں، آپ سے دریافت کرکے وہ مجھے مطلع کرینگے۔ یہ سُن کر فرمایا: دیکھیے، خان صاحب اس مجمع میں کہیں ضرور ہونگے۔ ذرا انھیں تلاش کرکے بلائیے۔ ہم دونوں حاضر ہوئے، تو ان سے فرمایا: آیندہ جب کبھی مالک رام صاحب مجھ سے ملنا چاہیں، مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ڈائری دیکھ کر جس دن وقت خالی ہو، انھیں بُلا لیجیے۔

اب کے ایک اور غیر معمولی بات ہوئی۔ ۱۹۵۰ء کے آخری سال کبھی کبھی وہ خود مجھے بلا بھیجتے تھے۔ محمد اجمل خان صاحب سے کہہ دیتے کہ کل صبح مالک رام کو بلا لیجیے۔ وہ مجھے وزارتِ خارجہ میں ٹیلیفون پر اطلاع دے دیتے کہ کل صبح آ جائیے۔

ستم یہ تھا کہ ملنے کا وقت وہی علی الصّباح پانچ بجے کا۔ اُن دنوں میرا قیام قرول باغ اور پوسا روڈ کی درمیانی بستی (ویسٹ ایکسٹنشن ایریا) میں تھا۔ گرمی کے موسم میں تو آسان تھا لیکن جاڑوں میں صبح ساڑھے چار بجے وہاں سے بائیسکل پر کنگ ایڈورڈ روڈ پہنچنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ لیکن الحمدللہ، مَیں امتحان میں پورا اُترا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مَیں حاضر نہ ہوا ہوں یا دیر سے پہنچا ہوں۔

Marfat.com

اب کے مَیں اپریل ۱۹۵۸ء تک دلی میں رہا۔ ان سے میری آخری ملاقات جمعہ، ۷ فروری کو ہوئی
پندرہ دن بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ وہاں جا پہنچے، جہاں ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی باری پر
جانے والا ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا الیہ راجعُون ؎

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

رحمہ اللّٰہ تعالیٰ

عرفت رَبّی بفسخ العزائم۔ مجھے اپنے عزم وارادہ کے ناپایدار اور ناکام رہنے سے
اپنے رب کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین ہوا۔ اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت سے پھر ایک مرتب
یہ حقیقت سامنے آئی۔ میرے احباب کو معلوم ہے کہ گزشتہ تین چار برس سے میری تندرستی ٹھیک
نہیں ہے، جس سے پڑھنے لکھنے کا کام بہت کم ہوگیا ہے۔ اسی باعث مَیں نے اپنے آخری مجموعے "تحقیقی
مضامین" کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ اپنی علالت کے پیشِ نظر میرا خیال نہیں کہ اب اس کے بعد
میں کوئی اور مجموعہ مرتب اور شائع کر سکونگا۔ اس کے باوجود یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔
فالحمد للّٰہ۔

مَیں نے گزشتہ تیس برسوں میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور کے بارے میں مختلف موضوعات
پر چند مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ سب ملک کے رسائل وجرائد میں منتشر پڑے تھے۔ ان میں سب سے
قدیم ان کی وفات کے فوراً بعد شائع ہوا تھا۔

مولانا آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی۔ پارسال حکومتِ ہند اور ملک نے ان کی
صد سالہ جنم دن منانے کا فیصلہ کیا۔ مجھ سے فرمائش کی گئی کہ موقع کی مناسبت کے پیشِ نظر یہ
مضامین جمع کر دوں۔ احباب نے ان کے جمع کرنے میں مستعدی سے تعاون کیا، اور کسی غیر معمولی
دقت کے بغیر یہ جمع ہو گئے۔ میں ان سب کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اصلی دقت ان پر نظرِ ثانی
کی تھی، جس کے بغیر مَیں انھیں شائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال جوں توں یہ کام بھی ہوگیا، اور نتیجہ
آپ کے سامنے ہے۔

ایک بات کی معذرت چاہتا ہوں:
مولانا مرحوم کی مختلف سرگرمیاں کچھ اس طرح سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ آپ اجتناب کی

Marfat.com

لاکھ کوشش کریں، ایک کے بیان میں دوسری کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس لیے آپ ان مضامین میں کہیں کہیں تکرار سے دوچار ہونگے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ تمہید کے طور پر ان کے خاندان کا تعارف کرانے کے لیے بسا اوقات ایک ہی بات بار بار لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے، پڑھنے والے اس سے بیلطف ہوں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ موجودہ حالات میں میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان مقامات کو حذف کر کے انھیں پھر ایک رشتے میں منسلک کر لیتا۔

بہر حال اگر قاری اس سے صرفِ نظر کر سکیں، تو شکر گزار ہونگا۔

اس مجموعے میں دو مضمون "غبارِ خاطر" اور "تذکرہ" کے عنوان سے ہیں۔ یہ دونوں میری مرتّب کردہ ان کتابوں کے مقدمے ہیں جو ساہتیہ اکادمی، نئی دلّی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ مَیں اکادمی کے اصحابِ مجاز کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ان مضامین کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی اجازت عنایت فرمائی۔

وَمَا توفیقی اِلّا بِاللّٰہِ العَظِیم۔

مالک رام

نئی دلّی

یکم جون، ۱۹۸۹ء

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

۱ ۔	مولانا آزاد کی تاریخ ولادت	۲۱
۲ ۔	مولانا ابوالکلام آزاد (پہلے بیس برس)	۲۵
۳ ۔	مولانا آزاد بحیثیت صحافی	۵۱
۴ ۔	مولانا آزاد کی خطابت	۶۹
۵ ۔	مولانا آزاد کے احسانات اُردو پر	۷۴
۶ ۔	تحریکِ آزادی کی مذہبی بنیاد (افکارِ آزاد کی روشنی میں)	۸۷
۷ ۔	غالب اور ابوالکلام آزاد	۱۲۷
۸ ۔	غبارِ خاطر	۱۴۴
۹ ۔	تذکرہ	۱۶۱
۱۰ ۔	کچھ کرنے کے کام	۱۷۳
۱۱ ۔	ابوالنصر غلام یٰسین آہ	۱۸۰

Marfat.com

Marfat.com

مَولانا آزاد کی تاریخِ ولادت

بظاہر مولانا آزاد کی تاریخ ولادت سے متعلق کوئی اختلاف یا اُلجھن نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ یہ انھوں نے خود لکھ دی تھی لیکن خدا بھلا کرے ہمایوں کبیر کا کہ انھوں نے اس کا موقع پیدا کر دیا۔

ہوا یہ کہ مولانا آزاد کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ہمایوں کبیر نے ان سے اپنی سوانح عمری لکھنے کی درخواست کی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، مرحوم اپنے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ ہمایوں کبیر کی درخواست پر بھی انھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے مولانا آزاد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ملک کی آزادی (۱۹۴۷ء) سے پہلے کے دس بارہ برس کے واقعات قلمبند کرا دیں کیونکہ یہ ملک کی تاریخ کا حصّہ ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریز حکومت سے گفت و شنید میں کانگریس کے نمایندے کی حیثیت سے سرگرم حصّہ لیا تھا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ مستقبل کے مؤرخ کو معلوم ہو کہ ان ایّام میں کیا ہوا اور تحریکِ آزادی کن مراحل سے گزر کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچی۔ اس پر مولانا نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہمایوں کبیر نے ان سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کتاب "انڈیا ونس فریڈم" مرتّب کی۔

Marfat.com

بدقسمتی سے کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا کا انتقال ہوگیا۔ کتاب کہیں جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس پر ہمایوں کبیر نے جو پیش لفظ لکھا، اس میں کہا[1]:

> مولانا کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۵۸ء میں، ان کے ۷۰ ویں یومِ ولادت کے موقع پر شائع ہو۔ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اب کتاب شائع ہوگی تو وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہونگے۔

اس عبارت نے مولانا آزاد کی ولادت کو ایک متنازع فیہ مسئلہ بنا دیا۔ ایک تو تحریر انگریزی میں اور اس پر لکھی ہوئی ہمایوں کبیر کی۔ ہمارے سرکاری حلقوں نے تحقیق کیے بغیر اس پر اعتماد کرلیا۔ خدا معلوم بعد کو کس نے اور کس شہ پر، مہینہ نومبر پر تاریخ گیارہ کا اضافہ کر کے اسے ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء بنادیا اور یوں ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء مولانا آزاد کی تاریخِ ولادت تسلیم کرلی گئی۔ یہ تاریخ غلط ہے۔

مولانا آزاد نے خود سب سے پہلے اپنے مختصر حالات "تذکرہ" میں لکھے تھے۔ اس میں اپنی پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں[2]:

> یہ غریب الدیارِ عہد و ناآشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیِ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم .... والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعِ ذیل سے، ہجری سال کا استخراج کیا تھا:
>
> جواں بخت و جواں طالع، جواں باد

۱۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) ص (پیش لفظ)

۲۔ تذکرہ (ساہتیہ اکیڈمی ایڈیشن: ۳۱۰

137129

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ ولادت،

۱- ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔

۲- ہجری تاریخ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ تھی۔

۳- تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا گیا تھا اور بطریقہ جُمل پیدائش کی تاریخ تھی، جواں بخت و جواں طالع، جواں باد۔

۱۸۸۸ء کا اعادہ انھوں نے ہمایوں کبیر کی اسی انگریزی کتاب کے پہلے باب میں بھی کیا ہے[1] جس میں مختصراً اپنے ابتدائی حالات درج کیے ہیں لیکن زیادہ تفصیل ہجری تاریخ میں ملتی ہے، جہاں ساتھ مہینہ بھی دیا ہے (ذوالحجہ)۔ وہ ہجری میں تاریخ ولادت لکھنے پر مجبور تھے کیونکہ دراصل یہی انھیں بتائی گئی ہوگی۔ وہ مکّہ میں پیدا ہوئے، جہاں کی پوری معاشرت اسلامی تھی۔ ان کی ننھیال اور دادھیال کے دونوں گھرانے بھی ٹھیٹ اسلامی بلکہ علماء کے تھے۔ پس تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں جگہ ہجری کے سوائے کوئی اور تقویم استعمال ہوتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ذی الحجہ کا مہینہ بھی ملتا ہے۔ یقیناً بتانے والے نے انھیں دن اور تاریخ بھی بتائی ہوگی، جو وہ بھول گئے۔ لیکن جتنی معلومات میسّر ہیں، یہ بھی کچھ کم نہیں۔

یکم ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ، عیسوی تقویم کے لحاظ سے جمعرات ۹ اگست ۱۸۸۸ء کو تھی[2]۔ یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا، اسی کے ساتھ سال ۱۳۰۵ھ ختم ہوگیا۔ یکم محرّم ۱۳۰۶ھ مطابق تھی، جمعہ ۷ ستمبر ۱۸۸۸ء کے اور ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کہیں اتوار، ربیع الاوّل ۱۳۰۶ھ کو ہوئی۔ کہاں ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ اور کہاں ربیع الاوّل ۱۳۰۶ھ! یہ ہے ان کے تاریخی نام "فیروز بخت"

۱- "انڈیا ونس فریڈم" ۲۰ (متن)

۲- تذکرہ: ۳۱۱ - ۳۱۲

۳- میں نے تاریخوں کے لیے INDIAN EPHEMERIS (A.D.1800-2000) مؤلفہ دیوان بہادر سوامی کنوپلّے استعمال کی ہے (مدراس۔ ۱۹۱۵ء)

Marfat.com

سے میل کھاتی ہے، نہ تاریخِ ولادت (جواں بخت و جواں طالع، جواں باد) کے مطابق ہے۔ ان دونوں سے (۱۳۰۵ھ) برآمد ہوتے ہیں۔ پس، ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء بہرحال غلط اور ناقابلِ قبول ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے[1] کہ مولانا آزاد نے ایک موقع پر خود انھیں اپنی صحیح تاریخِ ولادت ۸ یا ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی تھی۔ انھوں نے اسے ۱۷ یا ۱۸ اگست ۱۸۸۸ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ یہ اس جنتری کے مطابق ہوگا جو ان کے سامنے تھی۔ میں نے جس جنتری کا حوالہ دیا ہے اس کی رو سے یہ تاریخیں ۱۶ اور ۱۷ اگست کو پڑینگی۔ ان تقابلی جنتریوں میں ایک آدھ دن کا تفاوت عام طور پر ملتا ہے۔

خود میں نے ایک مرتبہ مولانا مرحوم سے اس مسئلے سے متعلق بات کی تھی۔ انھوں نے کسی تاریخ کا تعین تو نہیں کیا، لیکن میں نے ان کے بتائے ہوئے کوائف سے اندازہ کیا تھا کہ وہ بُدھ ۲۲ اگست ۱۸۸۸ء یعنی ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے تھے اور یہ میں لکھ بھی چکا ہوں[2]۔

غرض کہ وہ ۱۷/۱۸ اگست ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے ہوں یا ۲۲ اگست ۱۸۸۸ء کو، ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو بہرحال نہیں ہوئے، یہ تاریخ یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔ یقینی بات صرف یہ ہے کہ وہ ۹ اگست ۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے اور ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء ان کی تاریخِ ولادت نہیں ہے۔

۱۔ ماہنامہ "جامعہ" نئی دہلی، شمارہ فروری ۱۹۸۸ء: ۳۶

۲۔ ابوالکلام آزاد (احوال و آثار) مرتبۂ: مسعود الحسن عثمانی: ۵۲

Marfat.com

مَولانا ابوالکلام آزاد

(پہلے بیس برس)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے وہ بابر کے زمانے (۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) میں ہندستان آئے۔ شروع میں وہ دارالخلافہ آگرہ میں رہے، اور بعد کو غالباً اکبر کے عہد میں نقلِ مکان کر کے دلّی چلے آئے۔[1]

یہاں ہمیں ان کے بزرگوں میں سب سے پہلا نام مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی کا ملتا ہے۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کی کتاب "تذکرہ" کا مطالعہ کیا ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ دراصل یہ پوری کتاب انھیں مولانا جمال الدین کی سوانح عمری ہے۔ مولانا جمال الدین، اکبر کے ہمعصر تھے اور انھوں نے اس کی مذہبی بدعتوں اور اصلاحوں کی مخالفت کی تھی۔ ان کے حالات اس عہد کے بعض تذکروں میں ملتے ہیں۔[2]

مولانا جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مُرید تھے۔ حضرت مجدد مدتوں جہانگیر کے معتوب رہے تھے۔ اس کے باوجود شیخ محمد کا ان سے میل جول رکھنا

۱۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) : ۱

۲۔ مثلاً منتخب التواریخ، ۳ : ۱۱۳؛ اخبار الاخیار

Marfat.com

اور بادشاہِ وقت کی سیاست کی پروا نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ آزاد رَو اور دین کے معاملے میں بیخوف تھے۔

بعض لوگوں نے مولانا آزاد کے بزرگوں کا وطن قصور (ضلع لاہور) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قصور سے ان کا صرف اتنا تعلق تھا کہ مولانا آزاد کی دادی کے والد (یعنی مولانا خیرالدین کے نانا) مولانا منورالدّین غالباً قصور میں پیدا ہوئے اور ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں بسر ہوا تھا۔ مولانا منورالدّین کے والد مولانا رشیدالدّین بھی دراصل ہرات ہی کے خاندانِ قضات میں سے تھے۔ اور مولانا رشیدالدّین کے والد بزرگوار مولانا صدرالدّین وہاں شیخ طریقت کی حیثیت سے معروف تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ مولانا آزاد کے بزرگوں اور مولانا رشیدالدّین کے خاندان کے آپس میں ہرات میں بھی تعلقات رہے ہونگے۔ قاضی رشیدالدین، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ پنجاب آئے اور یہاں انھوں نے قصور میں سکونت اختیار کرلی۔ احمد شاہ نے انھیں صوبۂ لاہور کا قاضی القضاۃ اور اپنے نائب السّلطنت نورالدّین کا مشیر مقرر کردیا تھا[۳]۔ ان کے بیٹے منورالدّین اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ختم کرنے کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شہرت سُن کر دلّی آئے اور یہاں ان کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ مولانا آزاد نے خود لکھا ہے[۴] کہ مولانا منورالدّین نے قصور سے دلّی تک کا یہ سفر بیشتر پیدل طے کیا تھا، بالخصوص سرہند سے دلّی تک کی مسافت[۵]۔ یہ اس لیے کہ اس زمانے میں پنجاب کی سیاسی حالت بہت مخدوش تھی، ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں سواری کا انتظام کہاں ہوسکتا تھا۔ قرائن ایسے ہیں کہ یہ ۱۸۰۰-۱۸۰۱ کا زمانہ ہوگا، جب پنجاب میں سکھوں کی عملداری

۳۔ تذکرہ: ۲۶۔ آزاد کی کہانی (صفحہ ۳۰) میں ملیح آبادی نے مولانا منورالدّین کے والد کا نام سراج الدّین لکھا ہے۔ یہ سہو ہوگا، تذکرہ کا نام ہی صحیح اور معتبر ہے۔

۴۔ غالبؔ: ۲۸۱؛ نقشِ آزاد: ۳۱۱-۳۱۲؛ آزاد کی کہانی: ۴۱-۴۲

۵۔ آزاد کی کہانی: ۴۲

Marfat.com

اور دلّی کے نواح میں انگریزوں اور مرہٹوں کی باہمی آویزش کے باعث افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

مولانا منورالدّین دلّی آئے تو پھر چھ برس تک تعلیم کے سوائے اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا۔ اسی اثنا میں ان کے والد قاضی رشیدالدّین کا قصور میں انتقال ہوگیا۔ جب انھیں اس کی اطلاع ہوئی تو وہ قصور گئے اور خاندان کے بقیہ افراد کو ساتھ لوالائے اور اب مستقل طور پر یہاں دلّی میں سکونت اختیار کرلی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مشورے سے یہیں دلّی میں شادی کی۔ ان کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی کی شادی انھوں نے مولانا جمال الدّین کے خاندان کے نام لیوا شیخ محمد ہادی سے کردی۔ یہی شیخ محمد ہادی، مولانا آزاد کے جدِ امجد تھے[6]۔

غرض شجرۂ نسب یوں ہے: مولانا ابوالکلام آزاد بن مولانا خیرالدّین بن مولانا محمد ہادی بن شاہ محمد افضلؒ بن مولانا محمد حسنؒ۔ یہ سب بزرگ یہیں دلّی کے رہنے والے تھے۔ پس جب وہ اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھتے ہیں، یا کہتے ہیں کہ "آبائی وطن دہلی مرحوم ہے" تو اس میں حق بجانب ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا جمال الدّین عرف شیخ بہلول دہلوی جن کا ذکر اوپر ہوا، انھیں مولانا آزاد کے پردادا شاہ محمد افضل کے ننہالی سلسلے کے بزرگ تھے[9]۔

مولانا منورالدّین نے کرنے کو تو حکومتِ وقت کی ملازمت بھی اختیار کرلی، لیکن ملک کی عام طور پر اور شاہی خاندان کی خاص طور پر جو حالت سیاسی اور اخلاقی اس وقت تھی، وہ اس سے سخت دل برداشتہ تھے۔ بالآخر انھوں نے غالباً ۱۸۵۵ء میں یہاں سے ہجرت کرکے حجاز چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بھوپال کے راستے سے بمبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ارادہ یہ تھا کہ وہاں سے جہاز پر سوار ہونگے۔ بھوپال میں ان دنوں نواب سکندر بیگم حکمران تھیں۔ وہ مولانا

۶۔ تذکرہ: ۲۵
۷۔ تذکرہ: ۳۱
۸۔ ایضاً: نیز ص ۲۸۹
۹۔ ایضاً: ۳۱

Marfat.com

منورالدین کے وعظ اور پند ونصائح سے بہت متاثر ہوئیں۔ ہنوز یہ بھوپال ہی میں تھے، جب ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ (غدر) ہوا ہے۔ شورش فرو ہوجانے کے بعد یہ بمبئی پہنچے، لیکن آگے جانا نصیب نہ ہوا۔ پہلے علالت کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکے، بعد کو مریدوں نے جوشِ عقیدت میں روکے رکھا غرض اسی حیص بیص میں دو سال نکل گئے اور بالآخر ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ۱۸۵۸-۱۸۵۹ء کا زمانہ سمجھنا چاہیے[۱۰]۔

مولانا آزاد کے جدامجد شیخ محمد ہادی نے بہت کم عمری (غالباً ۱۸۳۴-۱۹۳۵ء) میں وفات پائی۔ اس وقت مولانا آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین صرف تین یا چار سال کے تھے؛ ان کا سالِ ولادت ۱۸۳۱ء ہے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت اپنے نانا[۱۱] منورالدین کی نگرانی میں ہوئی۔

جب مولانا منورالدین دلّی سے حج کے لیے روانہ ہوئے ہیں، تو یہ بھی نانا کے ساتھ تھے۔ ان کے بمبئی میں انتقال کرجانے کے بعد یہ حجاز گئے۔ چونکہ تعلیم ہندستان میں مکمل کرچکے تھے، اس لیے حجاز میں انھوں نے بعض علماء سے صرف اسناد کی تجدید کی۔ اسی سلسلے میں یہاں ان کی اس زمانے کے دو مشہور عالموں سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبداللہ سراج مکّے میں اور شیخ محمد ظاہر وتری مدینے میں حدیث وفقہ کے درس وتدریس میں مسلّم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ مولانا خیرالدین ان اصحاب کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور انھوں نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

مولانا خیرالدین نے حجاز پہنچنے کے کوئی دس سال بعد (یعنی ۱۸۷۰-۱۸۷۱ء میں) وہیں

۱۰- انڈیا ونس فریڈم (انگریزی): ۱

اس کے برخلاف "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا منورالدین کا "بمبئی میں دو سال قیام رہا، تیسرے سال مکّہ مکرّمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کرکے وہیں انتقال کیا۔ اسی سال ہندستان میں غدر ہوا۔" (ص ۶۳) اس میں اور انڈیا ونس فریڈم کے بیان میں متعدد نمایاں اختلافات ہیں۔ میں ذاتی طور پر دوسری کتاب کو زیادہ معتبر خیال کرتا ہوں۔ میرے خیال میں ملیح آبادی صاحب سے سہو ہوا۔ (نیز اس سلسلے میں دیکھیے نقشِ آزاد: ۱۷۷)

۱۱- آزاد کی کہانی:

Marfat.com

مدینے میں شادی کی[۱۲]۔ یہ خاتون جن کا اسم گرامی عالیہ[۱۳] تھا، ان کے استاد شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی تھیں۔ یہی مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ان سے متعلق مختلف ذرائع سے کچھ مزید معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔

مدینے میں پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ ان کا خاندان دراصل مراکش کا رہنے والا اور مدتوں سے علم وارشاد کا مرکز تھا۔ ان کے بزرگ ہجرت کرکے مدینے میں آبسے تھے۔ یہ خود یہیں مدینے میں پیدا ہوئی تھیں۔ مولانا نے ان سے متعلق لکھا ہے[۱۴] کہ انھیں اپنے گھر کے علمی ماحول کے باعث تعلیم کا غیر معمولی موقع ملا۔ فنونِ عربیہ اور دینیات میں متوسط درجے تک کی قابلیت ضرور تھی۔ لیکن اردو اچھی طرح نہیں جانتی یا بول سکتی تھیں۔ حج کے موقع پر جو ہندستانی عورتیں ان کی ملاقات کو آتیں، اُن سے بات چیت کرنے کے لیے انھیں مترجم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ مولانا آزاد نے ان کی دینی مسائل سے واقفیت کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں[۱۵]:

> ایک مرتبہ ایک عورت نے جو ملتان سے آئی تھی، فرائض یعنی تقسیم ورثہ کا ایک نہایت پیچیدہ سوال کیا۔ انھوں نے ایک منٹ کے اندر غور کرکے اس کا جواب دے دیا۔ وہ جواب مجھے یاد ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ آج مجھ سے کوئی اس نوعیت کا سوال کرے، تو میں بغیر کاغذ پر حساب کرنے کے اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

۱۲۔ آزاد کی کہانی : ۲۷

۱۳۔ میرے سامنے مولانا مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے؛ اس میں انھوں نے جناب عبدالشاہد خان شیروانی (علی گڑھ) کے استفسار پر اپنے اور اپنے خاندان سے متعلق کچھ معلومات مہیا کی تھیں۔ کئی تاریخوں اور ناموں کی تعیین اسی سے ہوئی، اس کا حوالہ جابجا 'غیر مطبوعہ تحریر' کے نشان سے دیا گیا ہے۔ یہ نام بھی وہیں ملا (ص ۵)

۱۴۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۵-۶

۱۵۔ ایضاً ۱۶

Marfat.com

مولانا خیرالدین کے ان خاتون سے پانچ بچے ہوئے۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔ لڑکیاں۔ زینب، فاطمہ اور حنیفہ (عرف محمودہ) تھیں، اور لڑکے ابوالنصر غلام یٰسین اور ابوالکلام غلام محی الدین احمد یعنی ہمارے مولانا آزاد۔

میرا خیال ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی کنیت: ابوالنصر اور ابوالکلام ان کے نام کے ساتھ ہی ان کے والدین نے رکھی ہوگی، آج بھی عرب ممالک میں یہ عام رواج ہے کہ بچے کی کنیت کا بچپن ہی میں اعلان کر دیتے ہیں۔

حنیفہ سب سے چھوٹی کا تخلص آبرو تھا، اور منجھلی فاطمہ کا آرزو۔ سب سے بڑی زینب قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ آبرو بیگم کا ذکر انھوں نے بہت جگہ کیا ہے۔ یہ ان کی بڑی ہمدرد اور غمگسار تھیں۔ ان کی شادی کلکتہ کے ایک صاحب احمد ابراہیم سے ہوئی تھی جو بعد کو خاندان کے پرانے تعلقات کے پیش نظر بھوپال میں ایک معقول عہدے پر فائز ہو کر مستقلاً وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء میں بھوپال ہی میں انتقال ہوا[16]۔ آرزو بیگم کا بھی ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں بھوپال میں انتقال ہو گیا[17]۔ مولانا خیرالدین اپنی مذہبی اور دینی حیثیت کے باعث اپنے گھر اور اپنے مریدوں کے حلقے میں "حضرت" کے عرف سے مشہور تھے[18]۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے بچپن میں یہ لوگ "چھوٹے حضرت" کہہ کر پکارتے تھے[19]۔

مولانا آزاد نے اپنی والدہ ماجدہ جناب عالیہ کی فیاضی اور سیر چشمی کا ایک دلکش واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں[20]:

> ان کی اخلاقی اور دماغی سیرت پر اب میں جس قدر غور کرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے بلند درجہ کی تھی۔ وہ نہایت فیاض اور سیر چشم تھیں؛ مفلس اور مصیبت زدہ آدمیوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

۱۶۔ انڈیا ونس فریڈم: ۲
۱۷۔ ہندستان ٹائمز، دلی، ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء: ۴
۱۸۔ آزاد کی کہانی: ۳۵۴
۱۹۔ غبارِ خاطر: ۹۹
۲۰۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۶

Marfat.com

والد مرحوم نے ایک مرتبہ نہایت قیمتی دوشالہ ان کے لیے منگوایا۔ جس دن انھوں نے اسے اوڑھا، اسی دن امِّ حبیب ان سے ملنے کے لیے آئی۔ یہ ایک غریب بیوہ تھی، جو ہمارے گھر سے قریب رہتی تھی۔ اس نے ایسا قیمتی دوشالہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا پلّہ ہاتھ میں لے کر نہایت طامع نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، اور بار بار کہنے لگی کہ ایسی چیز ہم غریبوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ والدہ نے فوراً دوشالہ کاندھے سے اُٹھایا اور ان کے کاندھے پر ڈال دیا۔

انسان کی سیرت بچپن میں بنتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی وقتی باتیں اور کام جو انسان کم سنی میں کرتا ہے، دراصل یہی وہ بنیادی اینٹیں ہیں، جن پر اس کے مستقل کردار کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر گھر کے بزرگ شروع میں بچّوں کی لغزشوں کی نگرانی نہ کریں، تو یہی باتیں بار بار کرنے سے عادتِ راسخہ بن کر بالآخر شخصیت کا رُوپ اختیار کر لیتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ شروع میں بڑے بوڑھے چھوٹے بچّوں کی شرارتوں اور بدعنوانیوں کو لاڈ چاؤ کے باعث انگیز کر لیتے ہیں، اور جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے، تو پھر شکایت کرنے لگتے ہیں، حال آنکہ اصلاح کا جو اصلی موقع تھا، وہ گنوا دیا، اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے ان کی والدہ کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں[۲۱]:

ایک شخص حافظ مبارک بخاری ہمارے یہاں رہتے تھے؛ وہ بہت اچھے خوشنویس تھے۔ اسی لیے والد مرحوم نے انھیں اپنی مصنفات کی تبییض کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ چونکہ انھیں اپنے کپڑوں کی صفائی کا زیادہ خیال نہیں رہتا تھا، اس لیے میں نے ایک دن کہہ دیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں۔ والدہ نے جیسے ہی سُنا، سخت برہم ہوئیں۔ اس وقت تک ان کی

۲۱۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۶۔ے

Marfat.com

باریک آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے: یا عینی لا تقل ھٰکذا۔ رُبَّما ھو اکرم عِند اللّٰہِ مِنک ومِنّا۔ (یعنی میری جان، ایسا نہ کہو۔ ہوسکتا ہے کہ خدا کی نظر میں وہ تم سے اور ہم سے عزیز تر ہو۔)

اسی طرح کا ایک واقعہ مولانا حالی نے سرسیّد کے بچپن سے متعلق لکھا ہے۔[۲۲]

ایک اور جگہ انھوں نے اپنی والدہ کی فصاحت اور غیر معمولی قوتِ بیانیہ کے بارے میں اور مکّے کی عورتوں کے ان کے پاس عقیدت اور استفادے کی غرض سے آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔[۲۳]

مولانا آزاد کے اپنے بیان کے مطابق، وہ ذوالحجّہ ۱۳۰۵ھ میں مکّے میں پیدا ہوئے۔[۲۴] ۱۳۰۵ھ کا ذوالحجّہ ۹ اگست سے ۶ ستمبر ۱۸۸۸ء تک تھا۔ لہٰذا ہم کہینگے کہ وہ اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ذوالحجّہ کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں، اس لیے عیسوی مہینے کی تاریخ کا تعیّن بھی ممکن نہیں۔[۲۵] تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے کیسے ان کی ولادت نومبر ۱۸۸۸ء لکھ دی۔[۲۶] اور حکومتِ ہند کی طرف سے بھی جو تقریبات مولانا آزاد کی پیدایش کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔ ان کے لیے ۱۱ نومبر ہی کی تاریخ مقرر کردی گئی ہے حال آنکہ نومبر کی صورت میں ہجری سال ۱۳۰۶ ہوجاتا ہے۔ میرے علم میں خود مولانا آزاد نے اپنی تاریخِ ولادت تذکرہ کے سوائے اور کہیں نہیں لکھی اور وہاں انھوں نے، صراحت سے "ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ" ہی لکھا ہے، جو اگست، ستمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ پس نومبر ۱۸۸۸ء کی تاریخ کسی طرح درست نہیں۔

---

۲۲ - حیاتِ جاوید: ۱۹ ۲۳ - آزاد کی کہانی: ۳۲۵-۳۲۶ ۲۴- تذکرہ: ۲۸۷

۲۵ - مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ "خود مجھے مولانا سے جو معلوم ہوا، اس کی بنا پر میں نے تاریخِ ولادت ۹ ذی الحجّہ ۱۳۰۵ھ یعنی ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء طے کی تھی"۔ (صبح، مارچ ۱۹۶۷، ص ۱۰) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو میرا مضمون جو اسی مجموعے میں شامل ہے۔

۲۶- انڈیا ونس فریڈم (دیباچہ): ۸

Marfat.com

مولانا آزاد کے والد نے مدینے میں شادی کر لینے کے بعد مکہ میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ چونکہ دولتِ عثمانیہ کے قانون کے تحت کوئی غیر ملکی غیر منقولہ جاداد کا مالک نہیں ہو سکتا تھا' اس لیے انھوں نے عثمانی جنسیت (نیشنلٹی) اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان جس قطعۂ زمین میں بنا تھا' وہ دراصل مولانا عبد اللہ سراج کی ملکیت تھا۔ مولانا خیر الدین نے ان سے یہ ٹکڑا خریدا اور اس پر مکان بنا لیا۔ یہ مکے کے محلہ قِدوہ میں باب السلام کے متصل تھا۔[۲۷] اس کے کوٹھے کی کھڑکیوں سے حرمِ مکہ کے میناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں۔ اور وہاں سے اذان کی آواز اتنی صاف اور بلند سنائی دیتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا' جیسے کوئی اس مکان کی چھت پر سے اذان دے رہا ہو۔[۲۸] اسی مکان میں مولانا آزاد پیدا ہوئے۔[۲۹] یہ مکان بلدیہ مکہ کی تعمیری اور توسیعی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ اب یہاں ایک بڑی کشادہ سڑک ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مولانا آزاد غالباً ہندستان میں یا راپور میں پیدا ہوئے: یہ بے بنیاد ہے۔

مولانا آزاد کے بھائی ابو النصر غلام یٰسین ان سے دو برس بڑے تھے[۳۰]، گویا وہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ کوئی چھ برس کے رہے ہوں گے' جب کہ ان کی تسمیہ خوانی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اس وقت بہت کم عمر تھے' یہی کوئی چار ایک سال کی عمر ہو گی؛ لیکن جیسا کہ ایسی تقریبوں میں چھوٹے بچے بالعموم کرتے ہیں' یہ بھی شوقیہ اس موقع پر بڑے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئے۔[۳۱] اس کے بعد دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونے لگی' بلکہ ایک زمانہ تک ان کی تینوں بہنیں بھی ان کے ساتھ درس میں شامل رہیں' خاص کر فارسی میں۔

تعلیم متعدد اساتذہ سے حاصل کی فارسی بیشتر اپنے والد مولانا خیر الدین سے پڑھی' بقیہ علوم ان کے علاوہ دوسروں سے بھی۔ خود لکھتے ہیں[۳۲] کہ ابتدائی تعلیم مکے میں شیخ محمد عمر اور شیخ حسن اساتذۂ حرم سے پائی۔ حجاز میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بچپن میں یعنی خاندان

۲۷۔ آزاد کی کہانی : ۷۱
۲۸۔ غبارِ خاطر : ۲۶۱
۲۹۔ تذکرہ : ۲۸۹
۳۰۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۲
۳۱۔ آزاد کی کہانی : ۳۲
۳۲۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۳

Marfat.com

کے ساتھ ہندستان آنے سے پہلے وہ مدرسۂ صولتیہ کے کسی استاد سے بھی پڑھتے رہے تھے۔ یہ مدرسہ مکّہ میں مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی نے ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ - ۱۸۷۵ء) میں قائم کیا تھا۔ ممکن ہے یہ دونوں استاد یا ان میں سے کوئی ایک اسی مدرسہ سے وابستہ رہے ہوں۔ قرآن انھوں نے یہیں ختم کیا۔ اس وقت ان کی عمر نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بات موجودہ صدر مدرّس (۱۹۶۸ء) صولتیہ مولانا سلیم سے ان لوگوں نے بیان کی تھی، جو مولانا کو بچپن میں جانتے تھے۔ ہندستان آنے کے بعد مختلف اوقات میں انھوں نے مولانا محمد یعقوب دہلوی[۳۳]، مولانا محمد ابراہیم[۳۴]، شمس العلماء مولانا سعادت حسین[۳۵]، مولانا محمد شاہ محدّث رامپوری[۳۶] سے مختلف علوم میں نصاب کی کتابیں پڑھیں اور بالآخر معقولات وغیرہ کی تکمیل مولوی نظیر الحسن امیٹھوی سے کی[۳۷]، جو مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا خیرالدین نے انھیں کلکتہ بُلا کے اِن دونوں بھائیوں کی تعلیم پر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ تین برس تک رہے تھے[۳۸]۔ مولانا خیرالدین ایک مرتبہ حجاز گئے تو پھر انھیں واپس وطن آنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ غالباً پہلی مرتبہ اپنے بعض گجراتی مریدوں کی درخواست پر حج کے لیے گئے تھے، ۱۸۸۰ء میں حجاز سے بمبئی آئے اور پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً آتے رہے[۳۹]۔ جہاں تک کھوج لگا سکا ہوں، آخری مرتبہ وہ ۱۸۹۸ء میں ہندستان آئے[۴۰]۔ اس مرتبہ آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مکّہ میں ایک حادثے میں ان کی اُلٹی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہاں کوئی تسلّی بخش علاج نہ ہو سکا اور انھیں مجبوراً ہندستان آنا پڑا۔ کلکتہ میں علاج کروایا گیا۔ اس سے وہ ٹھیک تو ہو گئے لیکن

۳۳۔ آزاد کی کہانی : ۱۹۰ ۳۴۔ ایضاً : ۱۹۲، ۲۱۰، ۳۷۵

۳۵۔ ایضاً : ۱۹۳ ۳۶۔ ایضاً : ۲۱۵، ۲۱۶

۳۷۔ ایضاً : ۱۹۱ نیز غیر مطبوعہ تحریر : ۳ (ملیح آبادی نے نام نذیرالحسن لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ مولانا نے خود نظیرالحسن لکھا ہے)

۳۸۔ آزاد کی کہانی : ۱۹۲ ۳۹۔ مولانا آزاد و مہادیو ڈیسائی : ۱۱

۴۰۔ ایضاً نیز غیر مطبوعہ تحریر : ۱

Marfat.com

بائیں ٹانگ چھوٹی رہ گئی، جس سے لنگ پیدا ہوگیا اور چلنے میں لکڑی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔
ہندستان پہنچ کر دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ ۱۸۹۹ء میں ان کی بیوی (یعنی مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ مانک تلہ (کلکتہ) کے قبرستان میں دفن ہوئیں[۴۱]۔ مولانا خیرالدین نے ان کی قبر پر ایک خاص قسم کی سنگ مرمر کی عمارت تعمیر کروادی؛ اور اسی کے پہلو میں اپنی قبر کے لیے بھی جگہ رکھی[۴۲]۔ بعد کو خاندان کے متعدد دوسرے افراد بھی یہیں دفن ہوئے۔
آزاد بھی والدین کے ساتھ آئے تھے۔ ان کی تعلیم مکے میں شروع ہو چکی تھی؛ اب یہاں کے اساتذہ سے اس کی تکمیل کا انتظام کیا گیا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں یعنی جب ان کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی، درسِ نظامی سے فارغ ہوئے۔ فاتحۂ فراغ کی مجلس ہی میں سات طالب علم ان کے حوالے کر دیے گئے کہ انھیں پڑھائیں، ان کے قیام اور ضروریات کا انتظام مولانا خیرالدین نے کر دیا تھا۔ بعد کو ان کی تعداد بڑھ کر بیس تک پہنچ گئی[۴۳]۔
ابھی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۱۸۹۸ء/۱۸۹۹ء میں یعنی دس گیارہ برس کے سن میں انھیں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا یوں ہوئی کہ ان کے گھر میں سینے پرونے اور اوپر کے کام پر ایک مغلانی علیمہ نام کی ملازم تھی[۴۴]۔ وہ سہسرام کی رہنے والی تھی۔ اس کا عرف غالباً آنانی تھا؛ غبارِ خاطر کے ایک خط میں اسی نام سے اس کا ذکر آیا ہے[۴۵]۔ علیمہ کا بھائی عبدالواحد خان کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ یہ صاحب مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی کے شاگرد اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ تھے[۴۶]۔ شعر بھی کہتے اور ادیب تخلص کرتے تھے[۴۷]۔ انھیں کی باتوں سے مولانا آزاد کو شعرگوئی کی ترغیب ہوئی۔ آزاد تخلص بھی عبدالواحد خان ہی نے تجویز کیا تھا[۴۸]۔ اس سے غرض یہ تھی کہ چونکہ گلدستوں میں شعرا کا کلام ان کے تخلص کی ابجدی ترتیب سے چھپتا تھا،

۴۱۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱
۴۲۔ آزاد کی کہانی: ۱۴۸
۴۳۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۴
۴۴۔ ایضاً: ۱۲
۴۵۔ غبارِ خاطر: ۲۵۰
۴۶۔ آزاد کی کہانی: ۲۳۰
۴۷۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱۲
۴۸۔ آزاد کی کہانی: ۲۳۵

Marfat.com

اس لیے ان کا نام بالکل آغاز میں چھپا کریگا۔ مولانا آزاد کی سب سے پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے ارمغانِ فرخ میں چھپی تھی، طرح تھی: "پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی"۔ مولانا نے اس پر گرہ لگا کر اسے مقطع کر دیا:

آزادِ بیخودی کے نشیب و فراز دیکھ
"پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی!"

مولانا آزاد نے شروع میں دو غزلیں اصلاح کے لیے منشی امیر مینائی کی خدمت میں بھیجیں[۴۹]، لیکن ان کی اصلاح انھیں کچھ پسند نہیں آئی؛ اس پر انھوں نے دوسرے استادِ وقت داغ دہلوی سے رجوع کیا؛ یہ سلسلہ بھی زیادہ دن تک نہ چل سکا[۵۰]۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی مشورہ کیا کیونکہ ان کی ایک نعت، جو بمبئی کے رسالے سفینۂ نجات کے اپریل ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شامل ہے، اس کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ شاگرد مولانا امداد حسین ظہور میرٹھی لکھا ملتا ہے[۵۱]۔ اس کے بعد ان کی نظر مولانا ظہیر احسن شوق نیموی پر پڑی جو علم اور واقفیتِ فن کے لحاظ سے اپنے معاصرین پر بدرجہا فوقیت رکھتے تھے۔ ان سے یہ پورے طور پر مطمئن رہے، اور پھر جتنے دن شاعری کی، اصلاح انھیں سے لی[۵۲]۔ اس اثنا میں کبھی کبھی فارسی میں بھی کہنے کا شوق رہا۔ بسبیل تذکرہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی، ان کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین نے آہ تخلص اختیار کیا۔ وہ داغ ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ مقامی مشاعروں میں شرکت کے علاوہ ان کا کلام بھی گلدستوں میں چھپنے لگا۔ انھوں نے نثر میں بھی کچھ مضامین اور دو ایک کتابیں بھی لکھیں[۵۳]۔ بہرحال مولانا آزاد کی شاعری کی مدت یہی دو تین برس کے قریب ہے۔

۴۹۔ ایضاً ۵۰۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱۳

۵۱۔ اردو (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۶ء: ۵۰ ۵۲۔ آزاد کی کہانی: ۳۴۲

۵۳۔ ان کے حالات اور کلام کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی، ۱۷۸۔ ۱۸۵؛ خم خانۂ جاوید: ۱۱۴؛ نیز آجکل (دہلی) اپریل ۱۹۶۲ء: ۳۔۷ (اس مجموعے میں ایک مفصل مضمون ان سے متعلق شامل ہے)

Marfat.com

اس کے بعد دوسری سرگرمیوں اور کششوں کے مقابلے میں یہ شوق ترک ہوگیا۔ ان کا اُردو اور فارسی منظوم کلام جو ملتا ہے۔ دو ڈھائی سو شعر سے زیادہ نہیں ہوگا۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنی قلیل مدت کی شاعری اور اتنی کم سنی میں بھی انھوں نے اتنی شہرت حاصل کرلی تھی کہ اتنی ۱۹۰۱ء میں انھوں نے مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی کی کتاب "تذکرۂ صادقہ یعنی الدّرالمنثور فی تراجم اہلِ صادق فور" کے لیے جو تقریظ لکھی، ناشر نے اس کے عنوان میں لکھا تھا:[۵۴]

ریویو برکتابِ مستطاب تذکرۂ صادقہ از مجمع فضائل ومحاسن، شاعرِ باکمال، سخنورِ بیمثال، مولوی ابوالکلام محی الدّین احمد صاحب آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

صَانَہُ اللّٰہُ مِنْ شَرِّ الْحُسَّادِ

یاد رہے کہ اس وقت ان کی عمر کسی طرح ۱۳ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

شاعری تو چھُٹ گئی لیکن اس کا شاخسانہ صحافت کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس نے آگے چل کر مستقل حیثیت اختیار کرلی۔ ہوا یہ کہ انھیں خیال ہوا کہ ایک ماہانہ گلدستہ نکالا جائے۔ یہ گویا اپنی شاعری کی تکمیل کا ایک ذریعہ تصور کیا گیا۔ چنانچہ مقامی اور بیرونی شعرا سے غزلیں جمع کی گئیں۔ اس گلدستہ کا نام نیرنگِ عالم تھا؛ اور یہ ہادی پریس کلکتہ میں چھپتا تھا۔ یہ پرچہ ۱۸۹۹ء کے آغاز میں نکلا۔ اور سال کے اندر ہی بند بھی ہوگیا، صرف آٹھ مہینے جاری رہا۔[۵۵]

اس کے بعد انھوں نے ایک شخص محمد موسیٰ سے بات چیت کرکے ہفتہ وار المصباح جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ان کے بقول[۵۶] ٹھیک عیدالفطر کے دن شائع ہوا؛ اس میں انھوں نے اداریہ 'عید' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ اداریہ غالباً بعض دوسرے اخباروں میں بھی نقل ہوا تھا: پیسہ اخبار لاہور کا نام تو خود مولانا ہی نے لکھا ہے۔ اگرچہ انھوں نے المصباح کی اشاعت کی

۵۴۔ اردو ادب (آزاد نمبر): ۳۳-۳۴

۵۵۔ آزاد کی کہانی: ۲۴۳

۵۶۔ ایضاً: ۲۵۷

Marfat.com

تاریخ اواخر سال ۱۹۰۰ء لکھی ہے، لیکن یہ سہو ہے۔ اس لیے کہ رمضان کی پہلی بیشک ۲۳ دسمبر ۱۹۰۰ء کو تھی، لیکن عید الفطر منگل کے دن ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی اس لیے المصباح کا پہلا شمارہ بھی اسی موقع پر شائع ہوا ہوگا۔ نیرنگِ عالم گلدستہ تھا اس میں ایڈیٹر کا کام برائے نام تھا یعنی باہر سے آئی ہوئی غزلوں کو جمع کر کے شائع کر دینا۔ پہلا پرچہ جو مولانا آزاد نے ٹھیک طور پر مرتب کیا، وہ یہی المصباح تھا۔ یہ اخبار بھی تین چار مہینے سے زیادہ نہیں چلا۔[۵۷]

اس وقت تک مولانا آزاد کی سب سے قدیم کتابی شکل میں شائع شدہ تصنیف جو میری نظر سے گزری ہے اس کا عنوان ہے "اعلان الحق"۔ اس میں انھوں نے اپنے والد مولانا خیرالدین کے مخالفوں کو ایک مسئلہ سے متعلق جواب دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خیرالدین نے نے رویتِ ہلالِ رمضان اور عید کے بارے میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ اگر مشرق میں کسی جگہ چاند دکھائی دے اور شرعی شرط پوری ہو جائیں، تو وہاں سے تار وغیرہ کے ذریعے سے رویت کی اطلاع ملنے پر مغرب والوں پر لازم ہے کہ اس کے مطابق روزہ رکھیں یا عید کریں۔ مخالف علما نے اس پر نہ صرف اعتراض کیا، بلکہ اس کی آڑ میں مولانا خیرالدین کی مخالفت شروع کر دی۔ مولانا آزاد نے اس رسالے میں انھیں مخالفوں کے دلائل کا رد کیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ ۲۵ رمضان ۱۳۱۹ھ یعنی ۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس اور چار پانچ مہینے کے قریب تھی۔

اسی رسالے کے آخر میں ان کے ایک دوسرے رسالے "ہدایت الرشید" کا اشتہار بھی ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

کہہ چکا ہوں کہ تین چار مہینے جاری رہ کر المصباح بھی اپریل/مئی ۱۹۰۲ء میں بند ہو گیا۔ اب اس کے بعد ان کا اپنا کوئی پرچہ نہیں رہا۔ لیکن جو خون منھ کو لگ چکا تھا، اس سے چھٹکارا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ انھوں نے مختلف رسالوں اور پرچوں میں مضامین لکھنا شروع کیے۔

۵۷۔ ایضاً

Marfat.com

ان میں مخزن، لاہور؛ احسن الاخبار، کلکتہ؛ تحفۂ احمدیہ، کلکتہ؛ مرقعِ عالم ہر دوئی وغیرہ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ اسی دور کا ایک مشہور ماہنامہ خدنگِ نظر تھا جسے ستمبر ۱۸۹۶ء سے منشی نوبت رائے نظر نکالتے تھے۔ اس میں نظم و نثر دونوں تھے۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ آپ اس میں نثر کا حصّہ بڑھا دیجیے اور میں اس کی ترتیب میں آپ کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوں۔ چنانچہ یہ انتظام نظر نے قبول کر لیا۔ اور کچھ مدّت تک اس کے حصّۂ نثر کی ترتیب و تدوین ان کے ذمے رہی۔ اس رسالے میں خود مولانا آزاد کا کلام اور نثری مضمون بھی چھپتے رہے۔ انھیں میں ایک مضمون "عکس ریز" کے موضوع پر تھا، جسے دیکھ کر مولانا شبلی نے ان سے کہا تھا کہ اس طرح کا کم از کم ایک مضمون الندوہ کے ہر شمارے کے لیے لکھ دیا کیجیے[۵۸]۔ بالآخر یہی چیز ان کے الندوہ کے نائب مدیر بننے میں بھی معاون ہوئی۔

۱۹۰۰-۱۹۰۱ء میں ان کی شادی کر دی گئی تھی۔ ان کے والد کے ایک بہت مخلص مرید مولوی آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ وہیں کلکتہ میں سروے آفس میں ملازم تھے؛ انھوں نے طویل ملازمت کے بعد اسی دفتر سے پنشن پائی۔ ان کے پانچ لڑکیاں تھیں[۵۹]۔ ان میں سے ایک کا نکاح انھوں نے ابوالنصر غلام یٰسین اور دوسری کا مولانا آزاد سے کر دیا[۶۰]۔ اس وقت ان کی عمر یہی ۱۲-۱۳ سال کے لگ بھگ تھی، اور ان کی بیوی کی سات آٹھ سال کی[۶۱]۔ مولانا آزاد کی بیوی، بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں، ان کا نام زلیخا تھا[۶۲]۔ انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم پوری طرح حاصل کی تھی اور عربی کی مبادیات سے آشنا تھیں؛ مطالعہ کا بہت شوق تھا[۶۳]۔ اولاد میں صرف ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا، چونکہ وہ بہت خوبصورت تھا، اس لیے اس کا نام حُسَین رکھا تھا[۶۴]۔ بیگم آزاد کا تپ دق سے ۹ اپریل ۱۹۴۲ء

۵۸۔ ایضاً: ۳۸۰

۵۹۔ ابوالکلام آزاد: ۲۰۳

۶۰۔ ذکرِ آزاد: ۴۲۵-۴۲۶

۶۱۔ آجکل ستمبر ۱۹۵۵ء: ۱۵

۶۲۔ غبارِ خاطر: ۲۳۵

۶۳۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۷

۶۴۔ ایضاً: ۱۱

Marfat.com

کو کلکتہ میں انتقال ہوا۔[۶۵]

لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۰۳ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے جو زندگی کا بہت بڑا مرحلہ ہے۔ ۱۹۰۳ء ہی کا دوسرا اہم واقعہ "لسانُ الصّدق" کا اجرا کیا۔

مولانا آزاد دس سال کی عمر سے نظم و نثر لکھ رہے تھے؛ ان کی تحریریں کلکتہ وغیرہ کے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی تھیں اور اس سے ان کی شہرت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی شہرت کُل ہند تھی یا وہ لوگ جن کی رائے کی واقعی کوئی وقعت یا اہمیت تھی، ان تک بھی یہ تحریریں پہنچ رہی تھیں۔ یہ کام "لسان الصّدق" نے کیا۔ یہ واقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد ملک کے علمی اور ادبی حلقوں کو معلوم ہوا کہ صحافت کے افق پر ایک نیا ستارہ اُبھرا ہے۔ اور ستارہ بھی کیسا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد

"لسان الصّدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ یہ پرچہ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی دھوم مچ گئی۔ ملک کے مشہور جرائد مثلاً وکیل امرتسر؛ پیسہ اخبار لاہور وغیرہ میں اس پر بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ مضمونوں کا معیار اتنا بلند اور طرزِ تحریر ایسا دلکش تھا کہ لوگوں نے اس کے مدیر کو کوئی معمّر عالم خیال کیا۔

بیجا نہ ہوگا اگر "لسان الصّدق" کے چار مقاصد جو اس کے پہلے شمارے میں چھپے تھے، یہاں بیان کر دیے جائیں۔

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
۲۔ ترقیِ اُردو یعنی اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں۔

۶۵۔ غبارِ خاطر: ۲۴۰؛ ذکرِ آزاد (ص ۴۲۹ - ۴۳۰) میں تاریخِ وفات ۱۹ اپریل چھپی ہے۔ یہ سہوِ کتابت ہے؛ صحیح ۹ اپریل ہے۔

Marfat.com

۴۔ تنقید یعنی اردو مصنفات پر منصفانہ ریویو کرنا۔

ذرا مدیرِ اعلیٰ کی عمر کا خیال کیجیے اور ان بلند بانگ مقاصد کا! انگریزی کی مثل ہے کہ آنے والے واقعات کی پرچھائیاں پہلے سے دکھائی دینے لگتی ہے؛ اس مثل کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ اسی رسالے کی شہرت ان کے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۴ء میں شرکت کا باعث ہوئی۔ یہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ اپریل تک لاہور میں ہوا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی مرتبہ مولانا حالی سے ملاقات ہوئی، جو جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد یہاں پہلے مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ملے۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی لسان الصدق کے مدیر ہیں، تو انھوں نے تعجب کیا۔ وہ ایک اعجوبے کے طور پر انھیں مولانا حالی سے ملانے کو لے گئے۔ وہاں پہنچے تو سلیم نے ان کی طرف اشارہ کر کے مولانا حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی کیا عمر ہوگی؟ حالی نے اپنے محتاط اور سنجیدہ انداز میں تامل سے فرمایا: ابھی بہت کم سن ہیں۔ لیکن جب سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں بتلایئے کیا عمر ہے؟ تو کہا کہ کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ جب سلیم نے بتلایا کہ لسان الصدق کے مدیر یہی ہیں، تو بیحد تعجب کیا۔ پھر اس دن جو تعلقات قائم ہوئے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ وہ استوار ہوتے چلے گئے۔[۶۶]

لسان الصدق کے ایک اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا لاہور سے بمبئی گئے تھے۔[۶۷] یہی وہ زمانہ ہے، جب ان کی آغا حشر کاشمیری اور علی خان سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ مل کر انھوں نے اسلام کی مدافعت میں آریہ سماج کے پرچارکوں اور عیسائی مشنریوں سے مناظرے کیے۔[۶۸] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مختلف مذاہب اور ان کی کتب مقدسہ سے متعلق وسیع واقفیت

۶۶۔ اس واقعے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے: آزاد کی کہانی: ۳۰۸۔ ۳۱۰۔ البتہ کہانی میں سال غلطی سے ۱۹۰۳ء لکھا گیا ہے۔ حال آنکہ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔

۶۷۔ شمارہ جون، جولائی ۱۹۰۴ء یہاں بمبئی میں ان کا پتہ تھا: ۱۳ بلاسس روڈ بائی کلہ

۶۸۔ آزاد کی کہانی: ۳۳۴۔ ۳۳۵

Marfat.com

حاصل ہوگئی، جو بعد کے زمانے میں بہت کام آئی۔ بمبئی میں وہ کافی زمانہ رہے۔ لسان الصدق کے کچھ شمارے انھوں نے مرتّب کرکے وہیں سے شائع کیے تھے۔

لسان الصدق بھی اپنے پیشروؤں (نیرنگِ عالم اور المصباح) کی طرح زیادہ دن تک نہ چل سکا، اگرچہ ان کی بہ نسبت یہ زیادہ سخت جان ثابت ہوا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا، اور اگلے مہینے دسمبر میں دوسرا۔ پہلی جلد میں بس یہی دو پرچے نکلے۔ نومبر و دسمبر، جنوری ۱۹۰۴ء سے دوسری جلد کا آغاز ہوا۔ لیکن سال بھر میں صرف نو شمارے شائع ہوسکے؛ اس جلد کا آخری پرچہ اگست/ستمبر کا مشترکہ شمارہ (نمبر ۸-۹) ہے اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا، بلکہ ۱۹۰۵ء کی پہلی سہ ماہی بھی خالی گئی۔ اپریل/مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے پر جلد ۳ کا نمبر ۱ و ۲ ثبت ہے۔ یہ پرچہ آگرے کے مشہور مفید عام پریس میں چھپا تھا۔

اواخر دسمبر ۱۹۰۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا۔ دراصل اس سال جلسہ پٹنے میں کرنے کا فیصلہ ہوچکا تھا، لیکن اجلاس کے ایّام میں وہاں طاعون پھیل گیا، اس پر یہ پٹنے کی جگہ لکھنؤ میں کیا گیا۔ پرنسپل دارالعلوم سر تھیوڈور ماریسن اس اجلاس کے صدر تھے۔[۶۹] مولانا آزاد اور ان کے برادرِ بزرگ مولانا ابوالنصر آہ دونوں اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کانفرنس کے ساتھ ہی مسلم پریس کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ بھی ۳۰ دسمبر ۱۹۰۴ء کو منعقد ہوا تھا۔ ایک اردو پریس کانفرنس کے قیام کا خیال مشہور پیسہ اخبار والے منشی محبوب عالم کو ۱۸۹۵ء میں آیا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور بالآخر ایک عام کانفرنس کا دعوت نامہ ملک بھر کے صحافیوں اور اخبار نویسوں کو بھیجا گیا۔ مئی ۱۸۹۶ء میں یہ جلسہ ہوا، بدقسمتی سے لاہور سے باہر کے لوگوں نے پورا تعاون نہ کیا، صرف دو ایڈیٹر جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے۔ اس پر منشی محبوب عالم مایوس ہوکر خاموش ہوگئے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد ۱۹۰۳ء میں عارضی طور پر

۶۹۔ مرقع کانفرنس: ۱۰۱

، خطبۂ صدارت کے لیے دیکھیے خطباتِ عالیہ (۱): ۲۴۱-۲۵۸

Marfat.com

ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔[۱] اسی زمانے میں انھوں نے ایک شذرہ اس پریس کانفرنس سے متعلق اپنے اخبار میں لکھا۔ اس میں انھوں نے منشی محبوب عالم کو توجہ دلائی کہ ان کی پریس کانفرنس سے متعلق تجویز بہت مفید اور وقت کی ضرورت تھی، انھیں چاہیے کہ اس کانفرنس کو پھر سے زندہ کرکے اسے فعّال جماعت بنائیں۔ منشی محبوب عالم نے یہ شذرہ اپنے اخبار میں نقل کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اس سال یعنی ۱۹۰۳ء کے اواخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا، تو اسی کے ساتھ "محمڈن پریس ایسوسی ایشن" کا بھی جلسہ ہوا۔ کانفرنس کے سلسلے میں ملک بھر کے مسلمان ایڈیٹر اور تعلیم یافتہ طبقے کے چیدہ اصحاب تو موجود ہی تھے، جلسہ کرنے میں کون سی مشکل تھی، لیکن جلسے کے بعد کی بے نمکی بھی دیکھنے کی چیز تھی۔

اب کے جو لکھنؤ میں کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا، تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پھر آواز اٹھائی گئی۔ منشی محبوب عالم صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پریس ایسوسی ایشن کے سلسلے میں بھی کوئی قدم اُٹھائیں۔ لیکن صدائے برنخاست۔ بلکہ منشی محبوب عالم صاحب لکھنؤ کانفرنس میں شرکت تک کے لیے نہیں آئے۔ تو یہ تھا پس منظر اس مسلم پریس کانفرنس کا جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ اب کے اس کے روح رواں حاجی ریاض الدین بریلوی ایڈیٹر الریاض تھے۔

اس جلسے میں متعدد اخبار و رسائل کے ایڈیٹروں کے علاوہ کوئی ۵۰ کے قریب معززین نے بھی حصّہ لیا۔ اس موقع پر مسلم پریس کانفرنس کو مستقل ادارہ بنانے کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر بہت تفصیلی اور گرما گرم بحث ہوئی۔ اس بحث میں حصّہ لینے والوں میں خواجہ غلام الثقلین، ایڈیٹر عصرِ جدید، میرٹھ؛ مولوی بشیر الدین، ایڈیٹر البشیر، اٹاوہ؛ منشی جمال احمد، ایڈیٹر ہمدرد کٹڑا (الٰہ آباد)؛ حاجی ریاض الدین احمد بریلوی، ایڈیٹر الریاض وغیرہ کے ساتھ مولوی ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر لسان الصدق کلکتہ کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔[۲]

۱۔ لسان الصدق، اپریل، مئی ۱۹۰۵ء : ۲۳

۲۔ یہ تمام تفصیلات لسان الصدق اپریل، مئی ۱۹۰۵ء (ص ۲۲-۲۶) سے لی گئی ہیں۔

Marfat.com

اس مسلم پریس کانفرنس کے انعقاد کے بعد مولانا آزاد نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، شاید وہ دلچسپی سے سنے جائینگے۔ لکھتے ہیں[۷۳]:

> اب رہی یہ بحث کہ پریس کانفرنس کا یہ دوبارہ قیام کہاں تک کامیاب ہوگا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ ہم کو اس کی پہلی کارروائی پر اطمینان ہے، اور نہ صرف ہم کو بلکہ کسی ذی فہم شخص کو ان جلسوں پر جو بلا مبالغہ بچّوں کا کھیل ہے، اطمینان ہو سکتا ہے؛ لیکن چونکہ ایسی حالت میں کوشش اور امید سے دست بردار ہونا نتیجۂ موہوم کا گمان بھی مٹا دیتا ہے۔ اس لیے سردست ہم اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دیتے۔ سوا اس کے کہ آیندہ کارروائیوں کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ جدید سکریٹری کی کوشش کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔

چند فقروں کی اس مختصر سی تحریر میں جو خود اعتمادی، معاملہ فہمی اور دور بینی لفظوں کا پردہ چاک کر کے جھانک رہی ہے، کیا یہ ایک سولہ سالہ نوجوان کے قلم سے باعثِ استعجاب ہے یا نہیں؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا آزاد کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ مسلم پریس کانفرنس اس ابتدائی جلسے کے بعد ابدی نیند سو گئی، جیسا کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ شمارے کے بعد لسان الصدق کا اور کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے فوراً ہی بعد وہ عراق کے سفر پر روانہ ہو گئے[۷۴]۔ پورا واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے۔

ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمٰن امرتسری، بڑے جہانیاں جہانگرد؛ اسی باعث وہ 'سیاحِ ممالک اسلامیہ' کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی ملاقات کہیں مولانا آزاد کے بڑے بھائی

۷۳۔ ایضاً: ۲۴-۲۵

۷۴۔ آزاد کی کہانی: ۳۱۱ یہاں اس سفر کی تاریخ ۱۹۰۴ء درج ہے، یہ غلط معلوم ہوتی ہے؛ صحیح ۱۹۰۵ء ہوگی اور وہ بھی اپریل کے بعد۔

Marfat.com

مولانا ابوالنصر آہ سے ہوگئی۔ آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ آہ نے حافظ عبدالرحمٰن کے ساتھ عراق جانے کا منصوبہ بنایا؛ مولانا آزاد بھی ساتھ ہو لیے۔ چنانچہ یہ قافلہ بغداد پہنچا۔ مولانا آزاد یہاں پہنچتے ہی بہت بیمار پڑ گئے، اور بالآخر واپس بمبئی چلے آئے۔[۷۵] آہ اور حافظ عبدالرحمٰن آگے بڑھے اور موصل اور دیار بکر اور شام تک گئے۔ یہیں شدید سردی کے باعث آہ کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ مولانا آزاد شاکی ہیں کہ ان کے رفیقِ سفر حافظ عبدالرحمٰن امرتسری صاحب نے بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ واپس بغداد آئے۔ یہاں ان دنوں برطانوی قنصل خانے میں منجملہ اور اصحاب کے اردو کے مشہور مصنف (بلکہ ہمارے ہاں رومانی تحریک کے بانیوں میں سے) سید سجاد حیدر یلدرم بھی ملازم تھے۔ انھوں نے بہت مدد کی۔ قصہ کوتاہ آہ بہت زار و نحیف حالت میں واپس بمبئی پہنچے۔ یہاں ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مولانا خیرالدین بیٹے کی علالت کی خبر سُن کر بمبئی پہنچے اور انھیں علاج کے لیے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے، لیکن بیسُود، ۱۹۰۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔[۷۶] مانک تلہ کے خاندانی حصہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا شبلی بمبئی آئے۔ وہ ان ایام میں حیدرآباد میں ناظمِ سررشتۂ علوم و فنون کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے تین چار برس سے خط و کتابت تھی، لیکن ملاقات پہلی مرتبہ یہیں بمبئی میں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے مقام شناس ہوگئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کا مشہور رسالہ 'الندوہ' جاری ہو چکا تھا۔ اور مولانا شبلی ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آسکو تو 'الندوہ' کی ترتیب و اشاعت

۷۵۔ ایضاً: ۱۷۹

۷۶۔ ایضاً: ۱۸۰ میں سالِ وفات ۱۹۰۷ء لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ان کا انتقال وسط ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے پرچے عالمگیر کے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک شذرہ بھی لکھا تھا۔

Marfat.com

اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن اس وقت مولانا آزاد کسی باعث یہ پیشکش قبول نہ کر سکے۔
مولانا شبلی چند دن کے قیام کے بعد حیدر آباد چلے گئے[۷۷]۔ در اصل انھوں نے حیدر آباد کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اگرچہ مدار المہام یعنی وزیر اعظم نے اسے منظور کر لیا تھا، ہنوز اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ حیدر آباد پہنچے، تو یہ تصدیق بھی مل گئی، اور وہ فروری ۱۹۰۵ء کے آغاز میں حیدر آباد سے پہلے اپنے وطن اعظم گڈھ اور وہاں سے لکھنؤ آ گئے[۷۸]۔ یہاں سے انھوں نے مولانا آزاد کو دوبارہ دعوت دی کہ آیئے اور الندوہ کو سنبھال لیجیے۔ اب کے انھوں نے اسے منظور کر لیا۔ اور لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان کا قیام مولانا شبلی ہی کے ساتھ رہا۔ دن رات کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ شبلی بھی اپنے مطالعے اور وسعتِ نظر اور ترقی پسندانہ خیالات میں ایک فرد تھے۔ مولانا آزاد نے یقیناً ان کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے الندوہ کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے الندوہ سے کیوں قطع تعلق کیا۔ خود انھوں نے لکھا ہے کہ "بمبئی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوا اور بمبئی چلا آیا"۔ یہ واقعہ کیا تھا، اور اس کا ان سے کیا تعلق تھا، ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ بہر حال وہ مارچ ۱۹۰۶ء میں الندوہ سے قطع تعلق کر کے بمبئی چلے گئے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کے دوران میں اُن کا تعارف وکیل، امرتسر کے مالک شیخ غلام محمدؐ سے ہو چکا تھا، جو اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ یہ ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا اور ملک میں اس کی رائے اور پالیسی کی بہت قدر تھی۔ لاہور سے واپسی کے بعد وہ وکیل کے لیے مضمون بھی لکھنے لگے تھے۔ اب جو الندوہ کا تعلق باقی نہ رہا، تو شیخ غلام محمد نے انھیں لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو یہاں آ جایئے اور وکیل کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیجیے۔ چنانچہ یہ بمبئی سے پہلے لاہور اور پھر وہاں سے اپریل ۱۹۰۶ء میں امرتسر پہنچ گئے۔ یہاں آنے کے کچھ مدت بعد ان کے بڑے بھائی

۷۷۔ حیاتِ شبلی : ۴۰۸ - ۴۰۹
۷۸۔ آزاد کی کہانی : ۳۱۷

Marfat.com

مولانا غلام یٰسین آہ کا انتقال ہوگیا جنھیں ان کے والد در اصل اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اور جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے، وہ بھی مذہبی عقائد میں، وعظ و تذکیر کے طور طریقے، چال ڈھال، وضع و کردار غرض تمام باتوں میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے[۷۹]۔ ان کی جوان مرگی کا مولانا خیر الدین کو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب ان کی امیدوں کا سہارا لے دے کے مولانا آزاد کی ذات رہ گئی۔ بھائی کے انتقال کی خبر سُن کر یہ پہلے ہی دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ والد نے خط لکھا اور پھر انھیں لانے کو آدمی امرتسر بھیج دیا۔ چنانچہ یہ نومبر ۱۹۰۶ء میں وکیل سے قطع تعلق کر کے کلکتہ چلے گئے۔ یوں گویا یہاں تقریباً سات مہینے وکیل کے ایڈیٹر رہے[۸۰]۔ گمانِ غالب ہے کہ والد نے ضرور انھیں اپنے مسلک پر ڈھالنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن یہ بہت پہلے سے کچھ گھر کے محدود اور قدامت پسندانہ ماحول کی وجہ سے، اور کچھ سرسیّد احمد خان کی تصنیفات کے اثر سے بالکل آزاد خیال ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ کسی طرح ان کے امتحان پر پورے نہیں اُتر سکتے تھے۔ یہاں کلکتہ میں وہ چندے ایک ہفتہ وار اخبار 'دار السّلطنت' کے ادارۂ تحریر سے متعلق رہے، لیکن ان کی اس کے مالکوں سے نبھ نہ سکی۔ وہ کچھ نیم سرکاری قسم کے لوگ تھے، قدم پھونک پھونک کر رکھنے والے اور سرکارِ دولتمدار کی چشم و ابرو کے اشاروں کی رعایت کرنے والے۔ اِدھر مولانا آزاد وکیل کے زمانۂ ادارت میں ہندستان تو الگ رہا، دنیا جہان کی سیاست اور عالمِ اسلامی کے معاملات پر رائے زنی کرتے رہے تھے۔ وہ بھلا کسی پابندی سے کیونکر خوش رہ سکتے تھے: غرض کہ یہ "دار السلطنت" سے الگ ہو گئے۔ چونکہ امرتسر سے علیحدگی کسی اختلاف کی بنا پر نہیں ہوئی تھی، وہ تو خانگی حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھی۔ اس لیے یہ اگلے ہی برس یعنی اگست / ستمبر ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے[۸۱]۔ اب کے انھوں نے اخبار میں یہ

۷۹۔ ایضاً: ۱۸۱

۸۰۔ ایضاً: ۳۱۵

۸۱۔ ایضاً: ۳۲۳۔ یہاں وکیل سے دونوں تعلقات کے درمیان آٹھ مہینے کا فاصلہ لکھا ہے۔

Marfat.com

تبدیلی کی کہ اسے ہفتہ میں تین مرتبہ چھاپنے کی بجائے سہ روزہ کر دیا یعنی ہفتہ میں دو بار۔
یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اس زمانے میں مولانا عبد اللہ العمادی بھی ان کے ساتھ وکیل میں کام کرتے رہے۔ مولانا عمادی بڑے فاضل اور خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ کبھی کبھی 'خدا بندہ' کے قلمی نام سے بھی لکھا کرتے تھے، جو عبداللہ کا ترجمہ ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا عمادی کی خوب گاڑھی چھنی۔ یہ انھیں ابتدائی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ بعد کو مولانا آزاد نے جب کلکتہ سے الہلال جاری کیا تو مولانا عمادی بھی اس کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔
ان کا شوّال ۱۳۶۶ھ (۱۲ اگست ۱۹۴۷ء) کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔[۸۳]
وکیل سے یہ دوسری مرتبہ کا تعلق بھی نو دس مہینے سے زیادہ نہیں رہا۔ وہ وسط ۱۹۰۸ء کے بعد (تقریباً جولائی، اگست میں) وکیل سے مستعفی ہو گئے۔ امرتسر سے پہلے بھوپال گئے اور وہاں اپنی ہمشیر آبرو بیگم سے ملتے ہوئے بمبئی کے راستے پونا چلے گئے۔ پنجاب میں گرمی کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس سال برسات بھی بہت کم ہوئی تھی۔ اس لیے یہ امرتسر کے قیام کے زمانے میں بیمار ہو گئے تھے، چنانچہ بحالیِ صحت کے لیے پونا کا موسم بہت اچھا رہا۔[۸۴]
یہیں پونا میں تھے کہ کلکتہ سے والد کی شدید علالت کا تار ملا۔ یہ والد کے پرانے خادم حافظ ولی اللہ بنارسی کے ساتھ کلکتہ روانہ ہو گئے۔ ۱۵ اگست کی صبح کو وہاں پہنچے۔ اگرچہ یہ ان کا مرض الموت تھا، لیکن ہوش و حواس آخر تک قائم رہے۔ آتے جاتے کو پہچانتے تھے؛ خود مولانا آزاد سے وفات سے آدھ گھنٹہ پہلے تک باتیں کرتے اور مختلف قسم کی ہدایتیں اور وصیتیں کرتے رہے۔ حافظ ولی اللہ نے جب حالت غیر دیکھی، تو سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ انھیں اشارے سے منع کر دیا اور خود سورۂ یٰسین پڑھنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔[۸۵] انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۸۳۔ یادِ رفتگاں (سید سلیمان ندوی): ۳۹۶
۸۴۔ آزاد کی کہانی: ۳۲۴-۳۲۵
۸۵۔ آزاد کی کہانی: ۱۴۶-۱۴۷

Marfat.com

جب ان کی بیوی کا ۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا ہے تو انھوں نے مانک تلہ کے قبرستان میں ان کی قبر پر ایک مختصر سا گنبد نما مقبرہ بنوا دیا تھا، اور اسی کے پہلو میں اپنے لیے بھی جگہ چھوڑ دی تھی۔ وہیں دفن ہوئے۔ ان کے مرید ہر سال ۱۸ رجب کو یہاں عرس کیا کرتے تھے، بوجوہ ۱۹۶۰ء کے بعد یہ نہ ہو سکا۔

اب یہ گویا ہر طرح آزاد ہو گئے: نے غمِ دُزدد نے غمِ کالا۔ انھوں نے باہر جانے کا پروگرام بنایا، چنانچہ عراق، لبنان، مصر کی سیر کرتے ہوئے فرانس تک پہنچے۔

کتابیات

۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی	(دہلی: اپریل ۱۹۵۸ء)
۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی)	مرتبہ ہمایوں کبیر	(بمبئی: ۱۹۵۹ء)
۳۔ اخبار الاخیار	از شیخ عبدالحق محدث دہلوی	(دہلی: ۱۹۳۲ء)
۴۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی)	مرتبہ ہمایوں کبیر	(کلکتہ: ۱۹۵۹ء)
۵۔ تذکرہ	از ابوالکلام آزاد	(طبع ثانی، دلی: ۱۹۶۸ء)
۶۔ حیاتِ جاوید	از الطاف حسین حالی	(علی گڑھ: ۱۹۲۶ء)
۷۔ حیاتِ شبلی	از سید سلیمان ندوی	(اعظم گڑھ: ۱۹۴۳ء)
۸۔ خطباتِ عالیہ (۱)	مرتبہ حاجی انوار احمد مارہروی	(علی گڑھ: ۱۹۲۹ء)
۹۔ خم خانۂ جاوید (۱)	از لالہ سری رام	(لاہور: ۱۹۰۸ء)
۱۰۔ ذکرِ آزاد	از عبدالرزاق ملیح آبادی	(کلکتہ: ۱۹۶۰ء)
۱۱۔ غالب	از غلام رسول مہر	(لاہور: ۱۹۴۶ء)
۱۲۔ غبارِ خاطر	از مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام	(دلی: ۱۹۶۷ء)
۱۳۔ غیر مطبوعہ تحریر (قلمی)	از مولانا ابوالکلام آزاد	
۱۴۔ مرقعِ کانفرنس	مرتبہ حاجی انوار احمد مارہروی	(علی گڑھ: ۱۹۳۵ء)

Marfat.com

۱۵۔ منتخب التواریخ (۳) از عبدالقادر بدایونی (کلکتہ: ۱۸۶۹ء)
۱۶۔ مولانا آزاد (انگریزی) ازمہادیو ڈیسائی (راج ہنس پریس دہلی)
۱۷۔ نقشِ آزاد مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور: ۱۹۵۸ء)
۱۸۔ یادِ رفتگاں از سید سلیمان ندوی (کراچی: ۱۹۵۵ء)

رسائل وغیرہ

۱۹۔ آجکل (ماہنامہ) دلّی، (ستمبر ۱۹۵۹ء؛ اپریل ۱۹۶۲ء)
۲۰۔ اردو، سہ ماہی کراچی اکتوبر ۱۹۶۶ء
۲۱۔ اردو ادب (آزاد نمبر) علی گڑھ ۱۹۵۹ء
۲۲۔ صبح (ماہنامہ) دلّی، مارچ ۱۹۶۷ء
۲۳۔ عالمگیر (ماہنامہ) لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۰۶ء
۲۴۔ لسان الصدق (ماہنامہ) کلکتہ، جون/جولائی ۱۹۰۴ء؛ اپریل/مئی ۱۹۰۵ء
۲۵۔ ہندستان ٹائمز (روزنامۂ انگریزی)، دلّی؛ ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء

Marfat.com

مَولانا آزاد بحیثیت صحافی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مادری زبان اُردو نہیں، عربی تھی۔ اُن کی والدہ عرب تھیں، مدینہ منوّرہ کے مفتی محمد بن ظاہر کی بھانجی۔ اس لیے لامحالہ مولانا آزاد کی اُن سے بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی۔ بچپن میں اُن کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی زبان سیکھنے کا امکان بھی نہ تھا کیونکہ خاندان حجاز میں مقیم تھا جہاں اُردو کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بعد کو جب تعلیم شروع ہوئی تو وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی! اور چونکہ اُن کا خاندان اپنے علم و فضل اور مذہبی تقدّس کے باعث برگزیدہ رہا تھا، اس لیے جب تعلیم کا آغاز ہوا تو دینیات پر خصوصی توجہ رہی۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں وقت کا درسِ نظامی مکمّل کر لیا تھا۔

لیکن وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اس سے پہلے داخل ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۹۹ء میں جب اُن کی عمر ہنوز ۱۱ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، شعر گوئی شروع کی۔ عام حالات میں گیارہ برس کا بچّہ کوئی علمی بات تو درکنار، اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو بھی مسلسل اور قابلِ لحاظ پیرایے میں بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، چہ جائے کہ شاعری۔ مولانا آزاد نے اس عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تو اب دستورِ زمانہ

Marfat.com

کے مطابق اُستاد کی ضرورت پیش آئی۔ اس دَور میں امیر مینائی اور داغ دہلوی کا ملک بھر میں طوطی بولتا تھا۔ بلا مبالغہ سیکڑوں شاگرد اُن کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھے۔ قدرتاً مولانا آزاد کی نگاہ بھی اُنھیں پر پڑی۔ پہلے اُنھوں نے داغ سے تعلق قائم کیا۔ ممکن ہے اس فیصلے میں اُن کی دہلویت بھی کسی حد تک اثر انداز رہی ہو، کیوں کہ مولانا آزاد کا اپنا خاندان بھی دہلوی تھا، اگرچہ وہ خود مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن اُن کے والد مولانا خیرالدین پشتینی دہلوی تھے، مشہور کوچۂ پنڈت کے رہنے والے۔ وہیں ان کا اپنا مکان تھا۔ غرض اُنھوں نے شروع میں داغ سے سلسلۂ تلمّذ قائم کیا، لیکن معلوم نہیں کیوں، یہ تعلّق دو تین غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہ اسے منقطع کر کے امیر مینائی سے مشورہ کرنے لگے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ دو چار غزلوں کے بعد دل اُچاٹ ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ محض زبان اور اصلاح کا نہیں، بلکہ نظریہ اور مقصدِ شاعری کا تھا۔ داغ اور امیر دونوں کی شاعری میں زبان پر زیادہ توجہ رہی۔ گہرائی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ داغ کی بہ نسبت امیر میں صلاحیت کہیں زیادہ تھی۔ اور ان کی خاندانی روایت اور پس منظر بھی داغ سے بہتر تھا۔ لیکن داغ کی شہرت اور مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے اُنھیں بہکایا اور وہ بھی اسی سطح پر باتیں کرنے لگے، جو داغ کا طرّۂ امتیاز تھیں۔ نتیجہ معلوم! خیر یہ دوسرا موضوع ہے، اس کے بارے میں پھر کبھی۔ امیر کے بعد مولانا آزاد نے چندے مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی سے اصلاح لی۔ یہ تعلّق نسبتاً طویل ثابت ہوا۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیوں کہ جلد ہی مولانا آزاد نے سرے سے شاعری ترک کر کے اپنی پوری توجہ نثر نگاری پر مرکوز کر دی۔ اُن کا سارا شعری سرمایہ جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، ڈھائی تین سو شعر سے زیادہ نہیں۔

غرض جیسا کہ کہا گیا مولانا آزاد نے دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی، لیکن یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں، بعض اور اصحاب بھی اتنی کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی فضیلت کی بات یہ ہے کہ اُنھیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاعری

Marfat.com

کے ساتھ ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے۔ تاکہ ہر مہینے "طرح" پر ملک کے مختلف شعرا سے غزلیں منگوا کر اس میں شائع کی جائیں۔ اس سے جہاں ایک مشغلہ ہاتھ آجائیگا وہیں مقابلے میں غزلیں کہنے سے مشق اور مزاولت میں بھی مدد ملیگی اور کلام میں ترقی کا موقع بھی ملیگا۔ ایک گیارہ برس کے لڑکے کا اس انداز سے سوچنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ غرض اُنھوں نے غالباً نومبر ۱۸۹۹ء میں "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا۔ میری نظر سے اس کا کوئی شمارہ نہیں گزرا، اگرچہ اس کے ایک شمارے کی موجودگی میرے علم میں ہے۔ اس پرچہ میں صرف شعری کلام چھپتا تھا۔ نثر بالکل نہیں تھی۔

"نیرنگِ عالم" پورا ایک برس بھی نہیں چلا، اس سے پہلے ہی بند ہوگیا۔ غالباً اس کے صرف آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ ہی سے ایک اور ماہانہ "المصباح" نام کا جاری کیا۔ یہ بھی زیادہ دن نہ جیا۔ اس کے کسی پرچے کی موجودگی میرے علم میں نہیں ہے۔

"نیرنگِ عالم" اور "المصباح" دونوں مشق کی ذیل میں آتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے خطاطوں اور خوشنویسوں کی مشق کے نمونے ملاحظہ کیے ہونگے۔ جب کوئی خوشنویس دھلی لکھنے کا عزم کرتا ہے، تو اس سے پہلے حروف اور دائرے کسی ترتیب اور نظام کے بغیر کاغذ پر بناتا رہتا ہے۔ بعض ایسی مشقیں جو مرورِ زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گئی ہیں، ان کی عجیب شان ہے۔ حرف پر حرف اور دائرے پر دائرہ لکھا اور بنا ہوا ہے۔ استاد کا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ ذرا بیٹھ جائے تاکہ اصلی دھلی لکھتے وقت ہاتھ میں لغزش نہ ہو۔ یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے گویا مشق کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۰۳ء میں کلکتہ سے ایک ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے دونوں پرچوں سے الگ نوعیت کا تھا۔ "نیرنگِ عالم" تو صرف شعری گلدستہ تھا، جس میں کوئی نثری حصہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ "المصباح" کا کوئی شمارہ نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس کے بارے میں یقین

Marfat.com

سے کچھ کہنا محال ہے، لیکن اس کے نام سے شبہہ گزرتا ہے کہ شاید یہ پرچہ مذہبی نوعیت کا ہو۔ اب "لسان الصّدق" جو جاری ہوا تو اس میں نظم بالکل نہیں تھی، اس کا پورا فائل میری نظر سے گزرا ہے۔

"لسان الصّدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ اس کے پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے ہیں، وہ یہ تھے :

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
۲۔ ترقیِ اُردو یعنی اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگلہ میں۔
۴۔ تنقید یعنی اُردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

جب یہ ماہنامہ جاری ہوا ہے تو مدیرِ محترم کی عمر پندرہ برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ عمر اور پرچے کے یہ بھاری بھرکم سنجیدہ مقاصد۔ پھر یہ محض دعا دی ہی نہیں رہے۔ اُنھوں نے واقعی "لسان الصّدق" کو اسمٌ بامسمّیٰ بنادیا۔ اُس کے مضامین کا معیار اتنا معتبر اور بلند تھا اور تحریر کا انداز ایسا دلکش کہ اُس نے فوراً صفِ اوّل کے پرچوں میں جگہ حاصل کرلی۔ ستارۂ درخشید و ماہِ کامل شد۔ اس پر اُس دور کے بعض پُرانے اور مشہور جرائد میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے مضامین میں لہجے کی متانت اور اسلوب کی ثقاہت سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی معمّر سا تجربہ کار بزرگ ہیں۔ اس رسالے نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور اس دَور کا مشہور ادارہ تھا؛ آج بھی ہے۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے اربابِ حل وعقد باہر کے اصحابِ علم حضرات کو خاص دعوت دے کر اُس میں تقریر کرنے کو بلاتے تھے۔ "لسان الصّدق" کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے اصحابِ مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اپنے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے اُنھیں لاہور آنے اور اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یقیناً اُنھوں نے خیال کیا ہوگا کہ حضرت مُدیر کوئی عمر رسیدہ عالمِ دین بزرگ ہیں۔

Marfat.com

تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ جب ابوالکلام آزاد کی شکل میں ایک ۱۵-۱۶ سال کا بے ریش و بُروت لڑکا اُن کے سامنے پیش ہوا تو اُن پر کیا گزری ہوگی۔ بارے، اگلے دن مولانا آزاد کی تقریر سے اُنھیں مایوسی نہیں ہوئی کیوں کہ اُس سے اگلے دن اُن سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن کا تقریر کا موضوع تھا "تبلیغِ اسلام کا طریق کار"۔ یہ اجلاس یکم اپریل ۱۹۰۴ء تک ہوئے تھے۔

اسی موقع پر مولانا آزاد کی پہلی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی۔ اس کا قصہ بھی بڑا پُرلطف ہے۔

مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن ان کی ملاقات مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی "لسان الصدق" کے مدیرِ شہیر ہیں تو اُنھوں نے بجا طور پر اُسے عجائبِ عالم میں سے خیال کیا۔ وہ اُنھیں مولانا حالی کے پاس لے گئے، جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے اور دوسری جگہ کسی دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب سلیم، مولانا آزاد کو ساتھ لیے پہنچے، تو تعارف سے پہلے انھوں نے حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی؟ حالی کی طبیعت کا حزم و احتیاط معلوم ہی ہے۔ اُنھوں نے تامل سے جواب دیا بھی بہت کم سن ہیں۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں، فرمائیے۔ آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟ بالآخر مولانا حالی نے کہا "یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی"۔ اب سلیم نے اُنھیں بتایا یہی "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا۔ اور وہ اس کے مضامین کے مداح تھے۔ ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے انھیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اُس دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے، ابتدائے زمانہ سے اُن میں استواری آئی اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔

افسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی کوئی اٹھارہ مہینے میں دم توڑ دیا۔ مولانا آزاد کی سیمابی

Marfat.com

فطرت اُنھیں کوئی کام جم کر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس پر اُن کا اکثر سفر میں رہنا! لازماً اس کا پرچے کی باقاعدہ اشاعت پر پڑا۔ بعض اوقات دو دو مہینوں کے لیے صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد دسمبر کا پرچہ شائع ہوا تو اس پر پہلی جلد کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے پورے سال میں صرف نو شمارے شائع ہوئے: اور اس سال کا آخری پرچہ بھی اگست اور ستمبر (۱۹۰۴ء) کا مشترکہ شمارہ تھا؛ اسی پر دوسری جلد ختم ہوگئی، ۱۹۰۴ء میں اور کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک پرچہ شائع ہوا۔ جو اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد "لسان الصدق" بند ہوگیا۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے انھیں دعوت دی کہ وہ لکھنؤ آئیں اور دارالعلوم ندوہ العلماء کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کی ترتیب و تدوین میں اُن کا ہاتھ بٹائیں۔ "الندوہ" کا فائیل آج بھی ملتا ہے۔ یہ خالص علمی و تحقیقاتی پرچہ تھا اور ندوۃ العلماء کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمے داری کا کام تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی خود اس کے ایڈیٹر تھے۔ اور وہی مجلسِ ندوۃ العلماء کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔ مولانا شبلی جس پائے کے مصنف اور نقاد ہیں، اُس کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اسے مدِنظر رکھتے ہوئے اُن کا سترہ سالہ نوجوان آزاد کو "الندوہ" کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا، حیرتناک تو ہے ہی، لیکن اس سے بڑھ کر یہ مولانا آزاد کے علم و فضل کی، اُن کی تحریر کے معیار اور پختگی کی، اُن کی ذاتی متانت اور رکھ رکھاؤ کی عادت بھی، اتنی بڑی سند ہے کہ مشکل سے اس کی مثال کہیں اور ملیگی۔

مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے "الندوہ" سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کسی وجہ سے خود یہ تعلق قطع کرلیا۔

"لسان الصدق" کی ادارت کے زمانے میں مولانا آزاد کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور بہت لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔ اُنھیں میں ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ اُس زمانے کے مشہور سہ روزہ اخبار "وکیل" کے مالک تھے

Marfat.com

جو امرتسر ہی سے شائع ہوتا تھا۔ جب مولانا آزاد "الندوہ" کے ادارۂ تحریر سے الگ ہوئے تو شیخ غلام محمد نے انھیں امرتسر آنے اور "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں "وکیل" میں بہت خوشگوار تبدیلیاں کیں، جس سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن ایک نجی حادثہ ایسا پیش آگیا کہ انھیں بادلِ ناخواستہ جلد ہی امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی تھے۔ مولانا ابو نصر غلام یٰسین آہ۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ہی نہج اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کا پیری مُریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتے اور بمبئی کے اطراف میں اُن کے مُریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے بیٹے غلام یٰسین آہ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہ بھی خوبو میں اپنے والد کے نقشِ قدم پر تھے، لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آہ تفریحاً عراق کے سفر پر گئے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہوگئی تو واپس بمبئی آئے، تاکہ یہاں مناسب علاج ہوسکے۔ حالت سُدھرنے کی جگہ اور بگڑ گئی۔ والد کلکتے سے بمبئی پہنچے اور انھیں ساتھ لوا لے گئے، لیکن اُن کا وقتِ آخیر آپہنچا تھا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وسطِ ۱۹۰۶ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد امرتسر میں "وکیل" سے وابستہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے انھیں لکھا کہ اب تم گھر آجاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا کہ انھیں اپنے ساتھ کلکتے لے آئے۔ اب کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتے چلے گئے۔ امرتسر کا زمانۂ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتے چلے تو گئے، لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام اُن کے سپرد کیا گیا، وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پند و وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دُور تھے۔ اُدھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انھوں نے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا، نہ مجھے یہ

Marfat.com

پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پانو کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھدار تھے۔ اُنھوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں، ان کی مرضی کے خلاف انھیں کسی کام پر مجبور کرنے سے فائدہ! اُنھوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے، تو تم واپس امرتسر جا سکتے ہو۔ اس پر یہ اگست ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ "وکیل" کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی لیکن اب کے ان کی صحت جواب دے گئی! وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بھی مشکل سے وہاں رہے، اور جولائی/اگست ۱۹۰۸ء میں "وکیل" سے الگ ہو گئے۔

اب اُن کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس دوران میں انھوں نے کئی پرچوں میں کام کیا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے، بعض دوسروں کے، جہاں وہ تنخواہ پر ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن وہ کہیں بھی رہے ہوں، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری اور بہبودی، خدمت گزاری اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ اخبار اور رسالے گویا ان کی تجربہ گاہ تھے، جہاں وہ اس تلاش میں رہے کہ ان کے اخبار کا مطمحِ نظر کیا ہونا چاہیے۔ اور آخر کار انھیں معلوم ہوا تو یہ کہ جس منزلِ مقصود کی تلاش میں وہ اتنے دن سے بھٹک رہے ہیں، وہ کہیں باہر نہیں، بلکہ خود ان کے پاس تھی۔ ان کے نصب العین کو ان کے جاری کردہ ہفتہ وار "الہلال" نے پورا کیا۔

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا

اور سب باتوں کو چھوڑ کر "الہلال" کے صرف ادارۂ تحریر ہی کو لیجیے، تو حیرت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے علاوہ اس میں مختلف اوقات میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا عبدالسلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے رہے اور سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہفتہ وار تو درکنار، کیا آج تک کسی اُردو ماہنامے کو بھی اتنا وقیع اور شاندار ادارۂ تحریر نصیب ہوا ہے۔ پھر ان مستقل معاونین کے علاوہ جو اسٹاف میں کام کرتے تھے، اس کے مضمون نگاروں میں ملک میں صفِ اوّل کے ادیب اور انشاپرداز

Marfat.com

تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکے کی نظمیں پہلی مرتبہ "الہلال" ہی میں شائع ہوئیں۔ غرض "الہلال" صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔

اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ انھوں نے شروع سے بار بار اعلان کیا "الہلال" ایک "دعوت" تھا، جس کا مقصد دین الٰہی اسلام کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو زندہ کرنا" تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات دیکھتے، بیباکانہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ اس میں حکومت اور عمّالِ حکومت پر خاص طور سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی ہونے لگی۔ حکومت بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی تھی۔ "الہلال" کو جاری ہوئے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا کہ حکومت نے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کرلی، جو فوراً ادا کر دی گئی۔

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں سے استصواب رائے کیے بغیر ہندستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ مولانا آزاد ہر ہفتے حکومت کی بدعنوانیوں پر تو پہلے ہی سے لکھتے آرہے تھے، اب انھیں جنگ کی وجہ سے اور وسیع میدان ہاتھ آگیا۔ یورپ میں جنگ کا پلڑا ابھی اس وقت تک جرمنی کے حق میں تھا۔ "الہلال" کے مضامین نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کے ۱۲ اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے دو شمارے (۱۶۱-۱۶۰) مشترک شائع ہوئے تھے۔ اس میں دو مضمون تھے: "حدیث الجنود" اور "سقوطِ انٹورپ"۔ نیز بیلجیم کے فوجیوں کی ایک تصویر، جس کے نیچے یہ عبارت چھپی تھی:

> بلجین سپاہ کا ایک گروہ جنگ سے پہلے آرام کر رہا ہے۔ یہ راحت کی آخری گھڑیاں تھیں، جو اس بدبخت قوم کو نصیب ہوئیں۔
>
> وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ
>
> (اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں؛ ۱۶: ۳۳)

Marfat.com

حکومت آج تک "الہلال" کے خلاف سخت اقدام سے اس لیے گریز کرتی رہی تھی کہ یہ ایک نیم مذہبی جریدہ ہے، لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ جب "الہلال" میں مندرجۂ صدر مضمون شائع ہوئے تو حکومت کے نفسِ ناطقہ روزنامہ "پانیر" الہ آباد نے اس کے خلاف ایک بہت سخت مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا:

PRO-GERMANISM IN CALCUTTA

اس میں منجملہ اور باتوں کے اخیر میں لکھا تھا کہ جو حکومت:

برطانوی فوج اور بحریہ کے خلاف ایسے نفرت انگیز اور کینہ پرور الزامات کی کھل چھٹی دیتی ہے، وہ سخت، غیر جرمن رواداری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

اس کے بعد حکومت بنگال نے "الہلال" کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی؛ مشترکہ شمارہ بھی ضبط کر لیا؛ اور مزید دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ یہ ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ مطالبہ تھا؛ انھوں نے پرچہ بند کر دیا۔ اس کے آخری پرچہ پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ ثبت ہے اور شمارہ نمبر ۲۰۔

کوئی سال بھر کے انتوا کے بعد انھوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کر دیا۔ صرف نام کا فرق تھا ورنہ دونوں کی صوری اور معنوی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن "البلاغ" نے بہت کم عمر پائی، یہی تقریباً پانچ مہینے۔ اوائل مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومتِ بنگال نے ڈیفنیس آف انڈیا آرڈی نینس (قانون) کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری کر دیا۔ اسی کے ساتھ "البلاغ" بند ہوگیا۔ بیشتر صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں؛ صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے، جہاں وہ جا سکتے تھے۔ بہار میں یہ سہولت تھی کہ کلکتے سے قریب تھا، لوگوں کو وہاں آنے جانے میں کم وقت اور خرچ پر ملاقات کا موقع مل سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے قیام کے لیے

۱۔ عام خیال ہے کہ پانیر نے یہ مضمون یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر کے ایما پر شائع کیا تھا۔

Marfat.com

رانچی کا انتخاب کیا۔ ابھی اس حکم پر اور ان کے رانچی میں قیام پر پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومتِ ہند نے ان کی رانچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔ وہ چار سال بعد ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔

"الہلال" کئی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس شان کا کوئی ہفتہ وار پرچہ اُردو میں شائع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی جو پرچے نکلے، ان کے سامنے نمونہ "الہلال" ہی کا رہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ شکل وصورت، مضامین کی ترتیب، اداریے، تصاویر وغیرہ میں "الہلال" کا تتبع کریں۔

لیکن ظاہری حُسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر "الہلال" کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کی طرزِ تحریر کی بداہت تھی۔ کاہے کو کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو، اربابِ حکومت کو، اکابرِ قوم کو، علماے دین کو یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں بخشا؛ اور کوئی ان کی نگاہِ احتساب کی زد سے باہر نہیں رہا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات ان کے سامنے آئی، اُنھوں نے اس پر بیخوفی اور عواقب سے بے پروا ہوکر گرفت کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر ہوا، اور اس سے حسبِ دلخواہ نتائج پیدا ہوئے۔

بدیشی حکومت پر ان کی گرفت اور بھی شدید تھی اور جب یہ خیال میں رہے کہ "الہلال" جولائی ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ اور "البلاغ" سمیت اپریل ۱۹۱۶ء میں بند ہوگیا۔ یعنی لے دے کے ساڑھے تین برس، تو اس کے اثرات اور نتائج سے حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دوسروں کا تو کیا ذکر، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرارداد حضور قیصر ہندِ ملک معظم سے ملک وقوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندستان نہیں پہنچے تھے۔ اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم رَو اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اس کے اعمال واقوال پر کڑی نکتہ چینی کی ابتدا "الہلال" ہی سے ہوئی۔

صحافت کو بوجوہ ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، لیکن "الہلال" کے کئی مضمون ادب میں بھی بلند

Marfat.com

مقام پانے کے مستحق ہیں۔ اُنھوں نے جو مقالے مسلم یونیورسٹی سے متعلق لکھے تھے، اور جن میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، وہ ادبی لحاظ سے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں۔ "الہلال" کی ادبی خدمات اپنی جگہ، لیکن اس رسالے کا جو اثر اپنے زمانے کے اور بعد کے لکھنے والوں نے قبول کیا، وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے بعض مشہور ادیب "الہلال" اور مولانا آزاد کے اسلوبِ تحریر کے متبع اور خوشہ چین تھے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ "الہلال" میں ان کی شعلہ نوائی اور اس کی پاداش میں ان کی چار سالہ نظر بندی نے انھیں ملک کے تمام حلقوں کا منظورِ نظر بنا دیا تھا۔ جب جنوری ۱۹۲۰ء میں وہ رانچی سے رہا ہوکر واپس آئے تو ہر کوئی اُن کے استقبال کے لیے بیقرار اور چشم براہ تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اہلِ وطن کے اس کلّی اعتماد اور اشتیاق اور عقیدت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملک کی سیاست کے لیے وقف کر دیا۔

یہ زمانہ انتہائی مصروفیت کا رہا۔ کانگریس اور خلافت تحریک نے ملک کے طول و عرض میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ مجلسِ خلافت کا ایک شاخسانہ جمعیۃ العلماء ہند کی شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ مولانا آزاد ان سب تنظیموں کے بیحد سرگرم اور فعّال کارکن تھے، وہ ان کی مجالسِ عاملہ کے رکن تھے اور بعض کے صدر بھی۔ لہٰذا اُن کے لیے سکون سے کسی ایک جگہ قیام کرنا محال ہوگیا۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ درمیان میں اگر کچھ وقت فرصت کا مل گیا تو وہ رفقائے کار اور ہم خیال احباب سے صلاح مشورے کی نذر ہو جاتا۔

لیکن وہ یہ کبھی نہیں بھولے کہ جب تک ایک اچھا اخبار پاس نہ ہو، اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ بالآخر اُنھوں نے ایک اور ہفتہ وار کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اس کا نام "پیغام" تھا۔ اس کا پہلا پرچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس کی نگرانی تو اُنھوں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی، لیکن ترتیب و تدوین کا سارا کام مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادی کے سپرد کر دیا۔

اگرچہ "پیغام" میں مولانا آزاد کے بعض بڑے معرکے کے مضامین شائع ہوئے، لیکن یہ واقع

Marfat.com

ہے کہ ملکی اور سیاسی ذمہ داریوں نے اُنھیں اتنی اجازت اور فرصت نہ دی کہ وہ اس میں کچھ زیادہ لکھ سکتے۔

اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ شہزادۂ ویلز کی ہندستان میں آمد اور اس کا ملک گیر بائیکاٹ ہے۔ وہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو یہاں پہنچے تھے۔ "پیغام" نے بھی اپنی بساط بھر اس بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں حصّہ لیا۔ حکومت بھلا اسے کیونکر معاف کرسکتی تھی۔ پہلے عبدالرزاق ملیح آبادی بحیثیت ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور انھیں دو سال کی سزا ہوگئی۔ ان کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خود مولانا آزاد گرفتار ہوئے، اور انھیں ایک سال کی قید بامشقّت کی سزا ہوئی۔ ان کے مقدمے کی آخری پیشی ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی۔ اسی دن انھوں نے اپنا وہ مشہور بیان عدالت کے سامنے پڑھا تھا، جو بعد کو "قولِ فیصل" کے عنوان سے شائع ہوا۔

ملیح آبادی اور مولانا آزاد دونوں کے جیل چلے جانے سے "پیغام" بند ہوگیا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا لے دے کے اس کی ساری تین مہینے کی عمر ہوئی۔ اس کے کُل تیرہ شمارے شائع ہوئے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ یہ تجربہ بھی بہت کامیاب رہا۔ اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ اس کی قیمت صرف دو آنہ فی شمارہ تھی۔ لیکن بعض اوقات یہ ایک ایک روپے میں بِکا اور ناشر پبلک کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر رہے:

خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود

یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ایک مذہبی اور صوفی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی نہج پر ہوئی تھی۔ لامحالہ عمر بھر مذہب ہی ان کے غور وفکر کا محور رہا۔ انھوں نے جو تحریری ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا، وہ بھی بیشتر مذہب اور مذہبی موضوعات ہی سے متعلّق ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملی زندگی اور معنوی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ بنیادی طور پر صحافی اور انشاء پرداز تھے۔ اُنھوں نے انیسویں صدی میں آنکھیں کھولی تھیں، اور نشر و تبلیغ کے ذرائع اور وسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ پریس اور اخبار کا مقام تہذیبِ جدید میں کتنا اہم ہے؛ اور اس کی قوت کتنی

Marfat.com

اور کیسی دُور رس ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ساری عمر کسی نہ کسی حیثیت سے رسائل وجرائد سے وابستہ رہے۔ اور جب بھی انھیں موقع ملا، اُنھوں نے اپنا ذاتی پرچہ جاری کرنے سے گریز نہیں کیا۔

"پیغام" کے بند ہو جانے کے بعد سیاسی سرگرمیوں نے اُنھیں کسی اور موضوع کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دی، لیکن وہ صحافت سے بیخبر نہیں رہے۔ کچھ دن تک تو وہ ایک روزنامہ جاری کرنے کے منصوبے پر بھی غور کرتے رہے۔ لیکن اس کے لیے جتنے سرمایے اور اہتمام اور لاؤ لشکر کی ضرورت ہے، اس کا انتظام آسان نہیں تھا۔ آخرکار اُنھوں نے روزنامہ کا خیال چھوڑ دیا اور "الہلال" ہی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ لوگ اس نام سے مانوس تھے اور دنیائے صحافت میں اس کی ساکھ بھی بہت بلند تھی۔

چنانچہ "الہلال" ثانی کا پہلا شمارہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو دلّی سے شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تدوین کی نگہداشت بھی مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادیؒ کے سپرد رہی۔ مولانا آزاد کی اپنی مصروفیتیں ایسی تھیں کہ وہ اس دَور میں اس کے لیے بہت کم لکھ سکے۔ قارئین جو ان کی تحریروں کے لیے بیصبری سے چشم براہ تھے، اس سے بہت مایوس ہوئے۔ لیکن مولانا آزاد بھی مجبور تھے۔ اُنھوں نے اتنے کام اپنے ذمّے لے رکھے تھے اور ہر روز ملک کے طول و عرض سے اتنے مطالبے ان کے پاس پہنچتے تھے کہ وہ اُنھیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں وہ لکھنے کے لیے کیوں کر نکال سکتے تھے!

"الہلال" ثانی چھ ہفتے یعنی ۱۰ جون ۱۹۲۷ء سے ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ اس دَور میں اس کے صرف ۲۰ شمارے شائع ہو سکے۔ غالباً یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب ہو۔

"الہلال" کے دَورِ ثانی میں ایک مسلسل مضمون "انسانیت مَوت کے دروازے پر" شائع ہوتا رہا تھا۔ حسبِ معمول اس پر بھی مضمون نگار کا نام نہیں تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ مضمون مولانا آزاد کا ہے۔ چنانچہ بعد کو کسی ناشر نے اُسے ان کے نام سے کتابی صورت

Marfat.com

میں شائع بھی کر دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف ہے، اور اس کا مولانا آزاد سے انتساب غلط ہے۔ یہ بات مجھے خود ملیح آبادی مرحوم نے بتائی تھی۔

مولانا آزاد کی تعلیم سراسر عربی اور فارسی زبانوں کے ذخیرے تک محدود رہی تھی۔ اس کے بعد ان کا مطالعہ بھی انھیں علوم تک محدود رہا۔ تقریر اور خطابت کا شوق انھیں بچپن سے تھا جیسا کہ ان کی بڑی ہمشیرہ فاطمہ بیگم المتخلص بہ آرزو کی شہادت سے ظاہر ہے، فرماتی ہیں:

> بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا، جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں بھی عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو، دلّی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ ہم کس کو دھکا دیں، اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔
>
> پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی کہ بھائی، سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے، ہم کیسے سمجھیں کہ یہاں ہزاروں آدمی کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

Marfat.com

خطابت کا یہ شوق عمر کے ساتھ اور بڑھا۔ بلکہ اب یہ شوق ان کی تحریر میں بھی در آیا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس کے باوجود کہ ان کی تحریر عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے گرانبار تھی، نہ اس کی روانی میں کمی آئی، نہ اس کی شگفتگی اور دلکشی میں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فقرے اینسے ترشے ترشائے ہوتے تھے جیسے کسی نے ہیرے کو کاٹ چھانٹ کر اُسے اور بھی حسین بنا دیا ہو۔

کئی لوگوں نے ان کی تحریر کی ثقالت اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی کثرت پر اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے اور اُسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ لیکن اس کی توجیہہ بڑی آسان ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ "الہلال" میں ان کے مخاطب اہلِ علم بلکہ طبقۂ علماء کے لوگ تھے۔ بیشتر موضوعات بھی انھیں اصحاب کی دلچسپی کے تھے۔ ایک طرف ان کی اپنی تعلیم کا پس منظر پیش نظر رکھیے، اور دوسری طرف ان کے مخاطبوں کا علم و فضل کا معیار، تو آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچینگے کہ ان مقالات میں اُنھوں نے جو زبان اور لب و لہجہ اختیار کیا، وہی درست تھا۔ وہ اس سے آسان زبان لکھنے پر قادر تھے۔ ترجمان القرآن میں (تفسیر سورۂ فاتحہ کے بعض حصوں کو چھوڑ کر) ان کی تحریر بہت سلیس اور آسان ہے، خاص کر اس کا ترجمہ اور حواشی والا حصہ۔ چونکہ اُنھیں معلوم تھا کہ ان کے بیشتر پڑھنے والے عوام اور تھوڑی استعداد کے لوگ ہونگے۔ اس لیے انھوں نے تکلموا الناس علی قدر عقولھم کے مصداق یہاں اسی سطح پر بات کی، جو قاری کے علم و فہم کے مطابق تھی۔ ترجمان القرآن کی بات آگئی۔

اگرچہ ان کی تعلیم اپنی خاندانی روایات کے مطابق دینی علوم سے متعلق ہوئی تھی، لیکن وہ اسی پر منحصر نہیں ہو گئے۔ انھوں نے وسیع اور گوناگوں مطالعے سے اس پر اضافہ کیا اور دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کرلی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ ہوگیا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا محور و مرکز رہا تھا۔ "الہلال" میں اُنھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق سے اُتار کر روزمرہ کے استعمال

Marfat.com

کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکّر اور تدبّر کے نتائج اُنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "ترجمان القرآن" میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمّل نہ ہو سکی! وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ اور وہ باقی حصّے کی تفسیر قلمبند نہ کر سکے۔ بیشک یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان رہا لیکن اگر مسئلے کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ دین کے بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اوّل میں ہیں اور ان کے بارے میں انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں محفوظ کر دیے ہیں تو اس نقصان کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے ان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان۔ اگر واقعی پوری توجّہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ناممکن ہے کہ قاری ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہو۔ اسے معلوم ہو جائیگا کہ کس ڈھنگ سے وہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر آپ خود بقیہ سپاروں کی تعبیر و تفسیر کر سکتے ہیں۔ گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ اور تفسیر ہی نہیں بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔

میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے کاملاً اجتناب کیا اور علوم و دعوتِ قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور اساسی شکل میں پیش کر دیا، جو شارع کا مقصود اور صدرِ اوّل کا اعتقاد تھا۔

چونکہ ترجمان القرآن میں قرآن کا ترجمہ اور حواشی ہیں اس لیے اس کی ادبی اہمیت پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ حال آنکہ اس پہلو سے بھی یہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہے۔

قرآن کے اُردو ترجمے بہت ہیں۔ زیادہ نہیں تو آٹھ دس تو یقیناً خود میری نظر سے بھی گزرے ہونگے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لطفِ زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی وہ اِلّا ماشاء اللہ، ان کے کسی پیشرو یا پیرو کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مترجم کو عربی اور اُردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو اور اس کا ادبی ذوق بھی اتنا بلند ہو کہ وہ محض معنی ہی کا خیال نہ رکھے بلکہ موزونیتِ مقام اور اُردو زبان کے مزاج سے بھی

Marfat.com

پوری طرح واقف ہو۔عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، ذاتی مطالعے اور مشق سے اُنھوں نے اُردو میں بھی اہلِ زبان کی سی مہارت پیدا کرلی تھی۔ اس پر مستزاد، قدرت کی طرف سے اُنھیں طبعِ موزوں اور شعر و ادب کا قابلِ رشک ذوق ودیعت ہوا تھا۔ ان سب باتوں نے مِل کر "ترجمان القرآن" کو تخلیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔

"الہلال" کے خالص ادبی مضامین کی طرف اشارہ کرچکا ہوں۔لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انھیں اس کوچے سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہوچکی تھی۔ اب ادب بھی مجبوراً چھُٹ گیا۔ حُسنِ اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انھوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالۂ قلم کیے، جو بعد کو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ "الہلال" ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے، "غبارِ خاطر" عہدِ کہولت بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔ یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے جو روزِ اوّل سے ان سے منسوب رہی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کرکے، وہ اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اُردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہوگیا ہوتا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

Marfat.com

مولانا آزاد کی خطابت

خطابت دُنیا کا سب سے قدیم ذریعۂ ابلاغ ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کا فن ابھی ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اگر کبھی قبیلوں کے درمیان لڑائی کی صورت پیدا ہو جاتی تو لازماً ایک قبیلے کے سردار یا شیخ کو اپنے خاندان کے افراد یا اور لوگوں کو دوسرے قبیلے کے خلاف اُبھارنے اور جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے، اُن سے خطاب کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی مبعوث ہوئے۔ تمام قوموں میں بزرگانِ دین کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان قابلِ احترام ہستیوں کا مقصدِ حیات اس کے سوائے کچھ اور نہیں تھا کہ وہ گم کردہ راہ بنی نوعِ انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف بُلائیں۔ یقیناً انھوں نے بھی رُشد و ہدایت کی تلقین خطاب ہی کے ذریعے سے کی ہوگی۔ غرض قبیلے کا سردار رہا ہو یا کوئی رشی مُنی اور نبی، اس کی کامیابی اس پر منحصر تھی کہ وہ کس حد تک اپنے سامعین یا مخاطبوں کو اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے کا یقین دلا سکتا ہے، اور انھیں امن و ہدایت کی راہ پر لگا سکتا ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال گیا ہے کہ تمام مذاہب کی الہامی کتابیں خطبات سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کتابوں کے اوّلین مخاطبوں میں تعلیم یافتہ آدمی بہت کم تھے؛ صرف گنتی کے چند لوگ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ لازماً نبی کو اپنا پیغام لوگوں تک زبانی گفتگو سے پہنچانا پڑا۔ جب افہام و تفہیم کا موضوع مشکل

Marfat.com

یا وضاحت طلب رہا ہوگا، یا اس سے متعلق ان کی قوم میں پہلے سے مخالفت اور مقابلے کا جذبہ موجود تھا، انھیں دلائل سے کام لینا پڑا اور مناظرانہ رویہ اختیار کر کے ان کے معتقدات کی تردید اور تغلیط کرنا پڑی۔ یہی باعث ہے کہ ان بنیادی کتابوں میں خطبات کی بھرمار ہے۔ ان سے جہاں صاحبِ کتاب کی فصاحت و بلاغت کا ثبوت ملتا ہے، وہیں ہمیں اُس زمانے کی خطابت کے نمونے بھی مہیا ہو گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ خطیب کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ وہ سامعین کو اپنا ہم خیال بنائے، یا انھیں کسی رائے یا تجویز پر متفق کرے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ موضوع ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کی اہمیت کے قائل ہوں اور کسی نہ کسی درجے میں اسے اپنی زندگی یا مقاصد کے لیے ضروری خیال کریں۔ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو؛ اس کے موافق آرا پیش کر سکے؛ اور مخالف دلائل کو رد کر سکے۔ اس کے اپنے خیالات میں کسی قسم کی پراگندگی یا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک، بعض اوقات طول کلامی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس سے اجتناب کر سکے اور اپنا مافی الضمیر جچے تلے الفاظ میں، لگی لپٹی رکھے بغیر، مدلل طریقے پر، سامعین کے سامنے رکھ سکے، تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ وہ غیر واضح طور پر اکتا دینے کی حد تک بولتا چلا جائے۔ اگر اسے اپنے موضوع کی صداقت کا یقین ہے؛ اگر اسے اس کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں، اور برجستہ اور مؤثر طریقے سے پیش کرنے میں، مہارت حاصل ہے؛ اگر وہ اپنی تقریر کو اس حد تک اصلیت کا رنگ دے سکتا ہے کہ سامع اسے سُن کر ایسا محسوس کرنے لگے کہ گویا وہ خود اس کے دل کی بات کہہ رہا ہے، تو اس کی تقریر کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں، جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں۔ عالی نسبی ایسی کہ صدیوں سے اُن کا خاندان زُہد و وَرَع اور رُشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا؛ ان کے والد مولانا خیرالدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے؛ مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حُسن کا نمونہ تھے؛ ان کے علم و فضل اور عربی و فارسی

Marfat.com

پر قدرت کے سب معترف ہیں؛ طلاقتِ زبان اور قوتِ بیان کے ساتھ انھیں بمثال حافظے کی نعمت بھی حاصل تھی. اور یہی چیزیں کامیاب اور مؤثر خطابت کے اجزاے ترکیبی ہیں.

مولانا خیرالدین کے مُریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا' جن کی تعلیم و تربیت کے لیے انھیں اکثر ان سے خطاب کرنا پڑتا تھا؛ نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجدِ ناخدا) میں بھی اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ کہا کرتے تھے. مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے یہ مثالیں ان کی کمسنی کے زمانے سے آتی رہیں. ممکن نہیں تھا کہ ان پر اس صورتِ حال کا اثر نہ ہوتا' اور ان کی اخّاذ طبیعت اس کے تتبّع کی کوشش نہ کرتی. چنانچہ ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بچپن ہی سے تقریر کرنے اور مقرّر بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے. ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم فرماتی ہیں[۵]:

> بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا جو اکثر بچّے کھیلا کرتے ہیں. ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے. مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے. پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلّا چلّا کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو؛ دلّی کے مولانا آرہے ہیں. ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے؛ ہم کس کو دھکّا دیں اور کہیں کہ راستہ دو. اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے؛ تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں.
>
> پھر بھائی صندوقوں پر سے اُترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے، جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں. کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں

---

۵ ماہنامہ "آجکل" (نئی دلّی) شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء: ص ۱۴-۱۵

Marfat.com

اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سُن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی، سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے؛ ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے؛ کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

پنجابی زبان کی مثل ہے: پُوت، کپُوت کے پانو پالنے ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بچّے کے بچپن ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کمسنی ہی سے تحریر و تقریر پر توجہ کرنے لگے تھے۔ وہ دس برس کی عمر سے نظم و نثر لکھنے لگے اور ان کی تحریریں کلکتے اور دوسری جگہوں کے رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے، وہ اپنا ذاتی ذریعۂ اشاعت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی عمر بمشکل ۱۱-۱۲ برس کی ہوگی کہ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے غالباً آٹھ شمارے نکلے۔ بہرحال سال کے اندر اندر یہ بند ہو گیا۔ اس کے چار پانچ برس بعد ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اپنا مشہور ماہنامہ "لِسان الصّدق" جاری کیا۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی اور اس کے مضامین کی سنجیدگی اور بلند پایگی کے پیشِ نظر بیشتر لوگوں نے خیال کیا کہ رسالے کا ایڈیٹر کوئی بزرگ اور معمّر عالم ہے۔ انجمن حمایت اسلام، لاہور اپنے اجلاس میں ملک کے مختلف حصّوں سے اہلِ علم و فضل کو تقریر کرنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ "لِسان الصّدق" کی تحریروں کے بلند معیار اور خطیبانہ انداز کو دیکھ کر انجمن کے اصحابِ مجاز نے رسالے کے ایڈیٹر "مولانا" ابوالکلام آزاد کو بھی اپنے اجلاسِ اپریل ۱۹۰۴ء کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت ان کی عمر یہی ۱۵-۱۶ برس کی رہی ہوگی۔ ممکن ہے، داعی حضرات کو انھیں دیکھ کر ان کی کم عمری سے کچھ مایوسی ہوئی ہو، لیکن ان کی تقریر سے یقیناً وہ مایوس نہیں ہوئے کیونکہ اس سے اگلے دن اُن سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یہ وہ دور ہے، جب ہندستان نے بعض مشہور خطیب و مقرر پیدا کیے۔ ان میں سے بیشتر انگریزی میں بولنے والے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی سے نابلد تھے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے اس زبان سے کام کاج اور مطالعے کی حد تک کے لیے خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی؛ لیکن انھیں اس میں بات چیت کرنے میں ہمیشہ تکلّف رہا کیونکہ وہ اپنے تلفّظ سے مطمئن نہیں تھے۔ بہرحال ان کا

Marfat.com

انگریزی میں تقریر نہ کرنا کسی طرح ان کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوا، نہ کسی کو اس سے انھیں کامیاب اور عظیم مقرّر تسلیم کرنے میں تامّل ہوا۔

ان کے خطبات کی پہلی جلد میں (جو میں شائع کرچکا ہوں) آپ کو ان کی بعض مشہور اور نمایندہ تقریریں ملینگی۔ ان میں جہاں اُن کے مطالعے اور نظر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے پر قدرت، مفکّرانہ طریقۂ استدلال، اور اپنے موقف کی صداقت اور صحت پر اعتمادِ کامل سطر سطر سے ظاہر ہے، وہیں آپ دیکھینگے کہ کلّموا النّاس علیٰ قدرِ عقولھم کے مصداق وہ اپنے سامعین کے مطابق زبان بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً جمعیتہ العلمارِ ہند اور خلافت کانفرنس کے خطبات کے مقابلے میں آپ کانگریس کا خطبہ دیکھیے یا تعلیمی کانفرنس کا خطبہ ملاحظہ کیجیے۔ چونکہ پہلے دونوں خطبوں کے مخاطب اہلِ علم مسلمان حضرات تھے، اس لیے ان کی زبان اور مسائل کی تفہیم کے لیے دلائل بھی انھیں کے معیار اور مذاق کے مطابق ہیں۔ زبان بھی نسبتہً مشکل ہے۔ دوسرے خطبوں کے مخاطب، ظاہر ہے کہ مخلوط رہے ہونگے؛ یہاں زبان بہت آسان ہے، جس کے سمجھنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آسکتی۔ لیکن ایک بات سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے: یہ ہے ان کا مصلحانہ اور مبشرانہ اندازِ خطاب۔ اُن کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامع اُن کی بات سمجھ جائے، پوری پوری سمجھ جائے، اور اُسے اس پر عمل کرنے میں کوئی تامّل یا جھجک محسوس نہ ہو۔ اسی لیے وہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بار بار کہنے یا دُہرانے سے دریغ نہیں کرتے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات کی وہ تقریریں جنھوں نے سامعین پر فوری اثر کیا تھا، جب بعد کو کاغذ پر منتقل ہوئیں، اور لوگوں نے انھیں اپنے کانوں سُنا نہیں، بلکہ آنکھوں سے پڑھا، تو ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بعض وقتی مسائل کی تقریروں سے قطع نظر، مولانا آزاد کی بیشتر تقریروں کی یہ بھی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اتنے لمبے عرصے کے بعد چھاپے میں بھی اتنی مؤثر اور کامیاب ہیں جتنی وہ اُس وقت تھیں جب وہ اپنے سامنے بیٹھے سامعین کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

Marfat.com

مولانا آزاد کے احسانات اردو پر

مولانا ابوالکلام کا اصلی نام محی الدّین احمد تھا، بلکہ غلام محی الدین احمد۔ وہ ایک ایسے خاندان کے آخری نام لیوا تھے جو صدیوں علم و فضل اور تصوف اور دعوت وارشاد کا گہوارہ رہا۔ مولانا کے والد مولانا محمد خیر الدّین تھے، جو اپنی خاندانی روایات کے حامل اور عالم و فاضل ہونے کے علاوہ صوفی صافی بزرگ بھی تھے۔ ملک کے مختلف حصّوں میں ان کے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ وہ مصنّف بھی تھے۔ ان کے متعدّد مذہبی رسالے ہندستان اور ترکی اور مصر میں شائع ہوئے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے تعلّقات حجاز سے بھی تھے اور وہاں آمدورفت بھی رہتی تھی۔ چنانچہ مولانا خیر الدّین کے ایک چچا کا انتقال مدینہ منوّرہ ہی میں ہوا۔ "غدر" کے بعد وہ خود بھی حجاز گئے اور وہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کرلی۔ مولانا آزاد اسی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس طرح عربی گویا ان کی مادری زبان تھی۔ مولانا کی ولادت اگست/ ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکّہ میں ہوئی اور زندگی کے ابتدائی دس برس بھی وہیں گذرے۔ تعلیم شروع سے گھر پر ہوئی اور وہ بھی ٹھیٹ مشرقی انداز کی اور دینی۔ عربی، فارسی کی تکمیل کی اور ۱۴-۱۵ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، تو شاگردوں کی ایک جماعت خود ان کے سپرد کردی گئی کہ انھیں

Marfat.com

پڑھائیں۔ یہ اس لیے کہ اس عہد میں تعلیم اس وقت تک مکمل خیال نہیں کی جاتی تھی جب تک کہ جو کچھ پڑھا ہے، وہ دوسروں کو بھی پڑھایا نہ جائے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب انھیں شاعری کا شوق ہوا۔ آزاد تخلص رکھا۔ اُس زمانے میں مولانا محمد ظہیر الحسن شوق نیموی (تلمیذ شمشاد لکھنوی) کی بہت شہرت تھی۔ وہ عربی اور فارسی کے منتہی تھے اور زبان پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تحقیقِ الفاظ سے متعلق ان کی سیّد ضامن علی جلالؔ لکھنوی سے جو بحث ہوئی، اس سے ان کے پایۂ علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جلال مرحوم کی زبان کے حُسن و قبح اور ساخت کے مسائل پر مجتہدانہ نظر تھی۔ ایسے مسلّم الثبوت استاد کے مقابلے میں عہدہ برآ ہونا شوقؔ ہی کا کام تھا۔ مولانا آزاد نے داغ اور امیر مینائی کا مختصر تجربہ کرنے کے بعد، غالباً اسی باعث ان کی شاگردی اختیار کی۔

۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں طرحی غزلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سال بھر کے اندر یہ گلدستہ بند ہو گیا۔ اس دوران میں وہ ملک کے دوسرے رسالوں اور گلدستوں میں بھی اپنا کلام بھیجتے رہے۔ ان میں مخزن (لاہور)، انتخاب (بمبئی)، اور ارمغانِ فرخ (بمبئی)، کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آخر الذکر کے مالک ایک صاحب عبدالحمید فرخ تھے۔ وہ ایک روزانہ اخبار بھی شائع کرتے تھے۔ منشی نوبت رائے نظرؔ نے بھی ایک گلدستہ "خدنگِ نظر" کے نام سے شائع کیا تھا۔ مولانا آزاد نے انھیں لکھا کہ آپ نظم کے ساتھ نثر کے مضمون بھی رسالے میں شامل کیجیے۔ اور یہ مضامین خود مہیا کرنے کی ذمہ داری لی۔ چنانچہ بہت دن تک نثر کا حصّہ مرتب کر کے یہ انھیں بھیجتے رہے۔

"نیرنگِ عالم" کے بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا کہ روایتی طریقے کی شاعری میں وہ اپنے وقت کا خون کر رہے ہیں۔ یہ شعر بازی نہ تو خود ان کے شایانِ شان ہے، نہ اس سے اردو ادب ہی میں کوئی پایدار اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد واقع یہ ہے کہ گویا انھوں نے شاعری ترک ہی کر دی۔ اب انھوں نے نومبر ۱۹۰۳ء میں ایک اور ماہانہ پرچہ "لسان الصّدق" کے نام سے نکالا؛ اس کا دائرہ وسیع تر تھا۔ اس میں علمی

Marfat.com

اور ادبی اور دینی موضوعات پر نثری مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے آغاز ہی سے بہت شہرت حاصل کی اور علمی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے بیشتر مضامین مولانا خود ہی لکھتے۔ ان مضامین کا معیار کتنا بلند تھا' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے:

۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت الاسلام (لاہور) کا جو سالانہ جلسہ ہوا' اس کے لیے منتظمین نے ملک کے مشہور اور موقر ماہنامہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر مولانا آزاد کو بھی دعوت دی کہ وہ تشریف لائیں اور جلسے میں تقریر کریں۔ مولانا آزاد نے دعوت قبول کرلی اور لاہور پہنچے۔ منتظمین اور دوسرے حاضرین نے جب انھیں دیکھا' تو انھیں یقین نہ آیا کہ پندرہ سولہ سال کے یہ صاحبزادے "لسان الصدق" کے اڈیٹر' مرتب اور مضمون نگار ہیں۔ حاضرین میں مولانا حالی اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے سے بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ اقبال بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ اگرچہ مخزن کے ذریعے میدان میں آچکے تھے۔ لیکن ابھی انھیں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مولانا حالی نے تو انھیں دیکھ کر یہ خیال کیا کہ مولانا آزاد نے اپنی جگہ اپنے بیٹے کو جلسے میں شمولیت کے لیے بھیج دیا ہے لیکن جب ان اصحاب نے ان کی تقریر سنی' تو سب ایمان لے آئے۔

لیکن افسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی زیادہ عمر نہ پائی۔ خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود۔ اسی کے بعد وہ مصر اور عراق اور ایران کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر لکھا ہے کہ انھوں نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی' یہ درست نہیں۔ انھوں نے یہ سفر تفریح کے لیے کیا تھا۔ ان کا تعلیمی دور اس سے بہت پہلے کلکتہ کے قیام کے زمانے ہی میں ختم ہوچکا تھا۔ واپسی پر وہ بمبئی میں رکے اور یہیں ان کے مراسم مولانا شبلی مرحوم سے پیدا ہوئے۔ شبلی بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ اس کے کچھ نفسیاتی اسباب بھی ہیں' جن کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا اپنا پایۂ علم و فضل اتنا بلند تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی دوسرا ان کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ لیکن مولانا آزاد کے وہ بھی قائل تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے' یہ ان کے اسی تعلق کا نتیجہ

Marfat.com

تھا کہ جب وہ ندوۃ العلوم، لکھنو کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو اس کی ادارت میں انھوں نے مولانا آزاد کو بھی شامل کرلیا۔

اِن ہی ایّام میں مولانا آزاد چندے پہلے بمبئی میں اور پھر امرتسر میں مقیم رہے۔ بمبئی میں انھوں نے اپنے برادرِ بزرگ ابوالنصر غلام یٰسین آہؔ اور آغا حشر کاشمیری کے ساتھ مل کر عیسائیوں سے مذہبی مناظروں میں بھی حصّہ لیا۔ اس زمانے میں امرتسر سے ایک اخبار "وکیل" ہفتے میں دوبار شائع ہوتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا بہت وقیع پرچہ تھا اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ مولانا آزاد ۱۹۰۶ء میں سات آٹھ مہینے اس کے مدیر رہے۔ لیکن ایک خانگی حادثے کے باعث وہ "وکیل" سے الگ ہوکر واپس کلکتہ چلے گئے۔

اب تک صحافت کے میدان میں ان کی تمام سرگرمیاں گویا ریاض کا حکم رکھتی تھیں جن کا نقطۂ معراج ۱۹۱۲ء میں الہلال کی شکل میں ظاہر ہوا۔

یہ ہفتہ وار پرچہ روزِ اوّل سے اس شان سے نکلا کہ ستارۂ درخشید و ماہ کامل شد کا مصداق بن گیا۔ نہ صرف اُردو صحافت اور نثر کی تاریخ ہی میں اس کا مقام بلند ہے۔ بلکہ ملک کی سیاست اور جنگِ آزادی میں بھی اس کا نمایاں حصّہ ہے۔ اس کی ظاہری شکل وصورت اور شان وشوکت بھی مرعوب کن تھی۔ یہ بڑے سائز اور عمدہ کاغذ پر، لوہے کے حرفوں میں مصوّر چھپتا تھا۔ مولانا کی خطابت اور قادر الکلامی اپنی پوری قوت وعظمت کے ساتھ اس میں جلوہ گر تھی۔ ان کا بدیع اسلوبِ تحریر، چبھتا ہوا طنز ومزاح، برجستہ اردو اور فارسی شعروں کا برمحل استعمال، غرض کون کون سی خوبی کی تعریف کی جائے۔

آں چہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

لیکن ان سب باتوں پر مستزاد، بلکہ اصلی اور بنیادی چیز اس کی دعوت تھی۔ دراصل یہ رسالہ صرف مسلمانوں کے لیے جاری کیا گیا تھا اور اس کا مقصد انھیں یہ یاد دلانا تھا کہ وہ کبھی خیرِ اُمّۃ اُخرِجَت لِلنّاسِ کا مصداق تھے۔ ان کے مضامین گویا اس متن کی تفسیر تھی کہ وہ کیوں "خَیرَ اُمّتٍ" تھے اور وہ کیوں اپنا یہ مقامِ بلند کھو بیٹھے اور اب کیسے اسے دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بہت تکرار اور ادّعا ہے۔ یہ اسلوب انھوں نے قرآن سے

Marfat.com

اخذ کیا۔ چوں کہ اصل میں وہ ایک ہی بات اپنے قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، اس لیے اسے مختلف پہلوؤں سے بار بار دہرانے کے سوائے ان کے لیے کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ کسی ڈھب سے ان کا مافی الضمیر سمجھ جائیں۔ اس میں انھیں لازماً مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف دعوت دینا پڑی کہ یہی اُن کے تمام علوم کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ واقع یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی نثر میں قرآنی آیات کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے، یہ اعجاز سے کم نہ تھا۔ وہی آیتیں جو ہر کوئی روزمرہ سنتا اور پڑھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ اُن کے معنی سمجھتا ہے، جب کسی جگہ ان کے مضمون میں آجاتیں تو یوں معلوم ہوتا کہ گویا اس نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور آج تک ان کے اصلی معنی اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔

اسی سے ایک اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ یہ عام طور پر کہا گیا ہے کہ اردو نثر کو مشکل اور ناقابلِ فہم بنانے میں الہلال اور مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک کم ہے، اور غلط زیادہ۔ ٹھیک اس لیے کہ واقعی مولانا کی زبان الہلال کے مضامین میں مشکل تھی۔ ان کی مادری زبان عربی تھی اور ان کی تعلیم بھی تمام تر عربی اور فارسی کی رہی تھی۔ پھر چوں کہ ان کے مخاطبِ اصلی مسلمان تھے اور موضوعِ سخن بھی دینی تھا، اس لیے انھوں نے وہ زبان استعمال کی، جو اس موضوع کے لیے مناسب تھی اور جو ان کے مخاطب بھی آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ لازماً یہ زبان مشکل ہونا ہی چاہیے تھی۔

لیکن یہ اعتراض غلط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسنِ اتفاق سے مولانا کی نثر سے اردو کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ عام نثر نہیں لکھ رہے تھے اور اس سے ان کا مقصد اردو ادب کی خدمت ہرگز نہیں تھا۔ انھوں نے الہلال جاری کیا تو مسلمانوں کے لیے اور اس میں جو کچھ لکھا، وہ بھی مسلمانوں کے لیے۔ غلطی کسی نے کی تو اُن کی نقل اور تقلید کرنے والوں نے۔ میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا، کیوں کہ یہ آسانی سے ہر ایک ذہن میں آجائینگے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان نقالوں نے یہ فرض کرلیا کہ جو زبان اور اسلوب مولانا اپنی تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں، وہ ہر جگہ چل سکتا ہے۔ (یہی دبابعد کے زمانے میں ٹیگور کی تقلید میں ادبِ لطیف کی بھی چلی) یہ "بزرگوار" رسالوں کے عام ادبی

Marfat.com

اور تاریخی اور تنقیدی، غرض ہر طرح کے مضمونوں میں وہی زبان اور ترکیبیں استعمال کرنے لگے. جن کے مخاطب صرف مسلمان نہیں تھے، بلکہ جن کے پڑھنے والے ملک کے ہر طبقے کے لوگ تھے، جن کا زبان کا علم محدود تھا۔ جب ان لوگوں نے یہ زبان دیکھی تو وہ بجا طور پر بدکے اور انھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر اردو یہی ہے تو یہ تو مسلمانوں کے سوائے اور کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

اس میں مولانا کا کیا قصور تھا؟ مولانا کی تحریریں مقصدی اور ایک خاص طبقے کے لیے تھیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان لوگوں نے یہ سوچے بغیر کہ "نہ ہر جائے مرکب تواں ختن" اسی زبان کو عام کر دینا چاہا۔ وہ اس میں ناکام رہے اور انھیں ناکام رہنا ہی چاہیے تھا کیوں کہ ایسی زبان عام نہیں ہو سکتی۔ البتہ ان کی بے سمجھی سے یہ نقصان ضرور ہوا کہ انھوں نے اردو کے مخالفوں کے ہاتھ میں ایک حربہ دے دیا۔

الہلال سے کئی فائدے ہوئے۔ اس کے باوجود کہ مولانا کا اصل مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت نہیں تھا، اس سے اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے متعدد مضامین ایسے ہیں کہ وہ اردو ادب میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ افسوس کہ ان کے اقتباس ہمارے نصاب کی کتابوں میں نہیں آئے۔ ورنہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اردو میں کیسے کیسے موضوعات پر کامیابی سے لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پھر اس سے اردو میں لکھنے والوں کا ایک گروہ تیار ہو گیا اور اگرچہ نقل کرنے والوں نے نقصان بھی پہنچایا، بہرحال انھوں نے بھی زبان کی خدمت کی۔ اور شروع میں مشکل لکھنے والے بھی آخر میں کوشش کر کے سہل اور آسان زبان لکھنے لگے۔

لیکن الہلال کا سب سے بڑا فائدہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۱۲ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا تھا۔ وہ عام طور پر اس کے ذمہ دار گردانے گئے تھے اور اسی لیے انگریز کا عتاب بھی زیادہ تر انھیں پر نازل ہوا تھا۔ سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کو عام سیاست میں عموماً اور کانگریس کی سرگرمیوں میں خصوصاً حصہ نہ لینے کا جو مشورہ دیا تھا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی

Marfat.com

مخالفت زائل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جب تک مسلمان تعلیمی اور اقتصادی میدانوں میں ہندوؤں کی سطح پر نہ آجائیں، انھیں انگریزوں کے خلاف کسی تحریک میں حصّہ نہیں لینا چاہیے۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے اس وقتی مشورے کو اپنی مستقل پالیسی بنالیا۔ اور سرسیّد کے بعد کے آنے والوں نے اس سے سرِمو انحراف کرنے کو گناہ خیال کیا۔ مولانا کا احتجاج اسی پالیسی کے خلاف تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی برادرانِ وطن کے دوش بدوش ملک کی آزادی کی جنگ میں حصّہ لیں۔ انھیں یہ بات کھلتی تھی کہ اسلام جو دنیا بھر کو "اِصر و اَغلال" سے آزاد کرانے کے لیے آیا تھا، اُس کے نام لیوا آج خود اپنی غلامی پر یوں مطمئن ہیں، گویا انھوں نے یہ سبق کبھی پڑھا ہی نہیں تھا۔ وہ انھیں بار بار جھنجوڑتے اور کچوکے دیتے کہ نیند کے ماتو! جاگو اور دیکھو کہ زمانہ کس تیزی سے آگے جارہا ہے۔ تم کس خوابِ غفلت میں پڑے ہو! اگر اب بھی بیدار نہ ہوئے تو قیامت تک ہاتھ ملتے رہ جاؤگے اور پھر پچتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بارے ان کی کوشش رنگ لائی اور مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا جس نے ملک کی آزادی کے حصول میں نمایاں حصّہ لیا۔

ہر ہفتے جو لاوا مولانا کے قلم سے الہلال کے صفحوں پر منتقل ہورہا تھا، اس سے ایک آگ سی لگ گئی۔ اس پرچے کی کامیابی اور ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ اگرچہ اس کی قیمت چار آنے فی پرچہ تھی (جو اس زمانے کے لحاظ سے خاصی قیمت تھی) یہ ہر ہفتے بتیس پچیس ہزار چھپتا تھا اور اسے کم از کم ایک لاکھ آدمی پڑھتے تھے۔ حکومتِ وقت بھی غافل نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ اگر مولانا کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو ان کی لگائی ہوئی آگ بتدریج اتنی پھیل جائیگی کہ پھر اسے انگلستان سے لے کر ہندستان تک کے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں بجھا سکیگا۔

اس دوران میں اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی تھی انگریز کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ کوئی کھلے بندوں بغاوت پھیلائے۔ آخر حکومتِ بنگال نے انھیں بنگال کی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ جس

Marfat.com

پریس میں الہلال چھپتا تھا اس کی ضمانت ضبط کرلی۔ اس کے دفتر اور ان کے مکان کی تلاشی لی اور منجملہ اور چیزوں کے ان کے تمام مسوّدے بھی اٹھالے گئے۔ پرچہ بند ہوگیا۔

مولانا آزاد بنگال سے باہر رانچی (بہار) میں مقیم ہو گئے۔ بعد کو حکومتِ ہند نے انھیں یہیں نظر بند کر دیا۔ رانچی ہی میں انھوں نے ایک دوست (میرزا فضل الدین احمد) کی درخواست پر اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی، جس کا نتیجہ "تذکرہ" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ انھوں نے آغاز اپنے بزرگوں کے حالات سے کیا لیکن وہ اپنے والد کے حالات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ خود اپنے متعلق صرف چند صفحے قلمبند کیے اور ان میں بھی بیشتر اشارے اور کنایے ہیں۔ ناشر نے ان کے لکھے ہوئے مسودے کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا، جس کا صرف پہلا حصہ منظرِ عام پر آیا۔ اسی کے آخر میں ان کے ذاتی حالات کے صفحات بھی ملحق ہیں۔ دوسرا حصّہ ہماری خوش قسمتی کے کیا کہنے کہ ضائع ہوگیا اور خدا معلوم، کیا ہوا!

"تذکرہ" کا اسلوبِ تحریر دراصل الہلال ہی کا تسلسل ہے، بلکہ یہاں یہ شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔ وہ صفحے کے صفحے عربی اور فارسی میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ "تذکرہ" میں مختلف کتابوں کے حوالے کثرت سے ہیں۔ جس بے سروسامانی کے عالم میں انھیں رانچی جانا پڑا تھا، اس کا ذکر انھوں نے کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ کتابخانہ تو درکنار، گنتی کی چند کتابیں بھی ان کے پاس نہیں تھیں۔ اس صورت میں یہ ان کی قوتِ حافظہ کا اعجاز ہے کہ انھوں نے اتنی کثرت سے حوالے اس میں درج کیے، اور کسی جگہ غلطی یا سہو نہیں ہوا۔

رہائی کے بعد انھوں نے الہلال کا نقشِ ثانی البلاغ کی شکل میں شائع کرنا چاہا تھا لیکن اخراجات اور کاغذ اور طباعت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا بالآخر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اسے دوبارہ شائع کرنا شروع کیا اور اس کا دفتر دہلی منتقل کر دیا جو زیادہ مرکزی جگہ تھی لیکن یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ اور پرچہ چھ مہینے بعد بند ہوگیا۔

گاندھی جی کے جنوبی افریقہ سے وطن آنے کے بعد مولانا ان کے ساتھ ہو گئے اور ان کے کردار کے استقلال اور عظمت کی دلیل ہے کہ جو قدم انھوں نے ۱۹۲۰ء میں اٹھایا تھا، مرتے دم تک اسے پیچھے ہٹانے کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ جیسا کہ انھوں نے

Marfat.com

کسی جگہ لکھا ہے، زندگی کی شاہراہ کا یہی حال ہے۔ یہاں ایک مرتبہ فیصلہ کر لینے کے بعد اس راہ پر چلنے والوں میں پیچھے مڑ کے دیکھنے والے کی کوئی جگہ نہیں۔ انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں پورے جوش و خروش اور یکسوئی و تندہی کے ساتھ حصّہ لیا۔ قید و بند کی سختیوں سے بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی، لغزش تو درکنار اس سے اس میں اور ثبات اور استواری پیدا ہوگئی۔ قوم نے ان کی خدمات کا یوں اعتراف کیا کہ ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کے خاص اجلاس دہلی کا صدر منتخب کیا، جو اس وقت اِس کے پاس سب سے بڑا اعزاز اور انعام تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۵ سال کی تھی اور یہ کانگریس کی تاریخ میں ریکارڈ ہے۔ آج تک اُن سے کم عمر کا کوئی شخص اس کا صدر نہیں ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اس میں کونسلوں میں داخلے کے سوال پر جس طرح مدلّل بحث کی ہے اس سے ان کی بالغ نظری اور سیاسی دور اندیشی کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں ان کے شاہکار "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ شروع میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پوری تفصیل سے قلمبند کی ہے۔ اس سے ان کے علم و فضل کی وسعت اور فکر و نظر کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ اگر اسی شرح و بسط سے پوری تفسیر لکھی جاتی تو کتاب تین جلدوں میں بھی مکمل نہ ہو سکتی۔ اس لیے انھوں نے اس کے بعد متن کے تفسیری ترجمے اور حاشیے میں ایسے اشارے لکھ دینے پر کفایت کی کہ اگر انسان خود توجہ اور امعانِ نظر سے ان پر غور کرے تو وہ آسانی سے اس کے وسیع معانی پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس کی دوسری جلد چند برس بعد شائع ہوئی۔ تیسری جلد وہ لکھ ہی نہ سکے۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ مولانا اساسی طور پر عالم دین تھے۔ ان کی زندگی کے تمام دوسرے رُخ اسی ایک اصل کی فرع ہیں۔ ان کی ادبیت، خطابت، سیاست — سب کے سوتے دین ہی کے چشمے سے پھوٹتے ہیں۔ انھوں نے دین کا علم روایتی طریقے پر حاصل کیا۔ جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، اسے اساتذہ سے پڑھا۔ لیکن انھوں نے اسی پر قناعت نہیں کر لی۔ بلکہ جو کچھ پڑھا تھا، اسے خود اپنی عقل اور وجدان کی کسوٹی پر کسا اور خُذ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَرَ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس میں سے وہ رکھ لیا جو حالاتِ حاضرہ اور تحقیقاتِ جدیدہ کے مطابق تھا، اور اسے چھوڑ دیا جو تقویم پارینہ بن چکا

Marfat.com

تھا۔ اس کے بعد انھوں نے خود اپنے تدبّر و تفکر سے اس پر اضافہ کیا اور اس کا نتیجہ "ترجمان القرآن" کی شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ ان دونوں جلدوں میں انھوں نے قرآن کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادبی لحاظ سے بھی اتنا حسین اور برجستہ ہے کہ اسے ادبی تخلیق کا درجہ دیا جانا چاہیے تھا۔ افسوس کہ اس پر اس پہلو سے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

مثال کے طور پر صرف سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اللہ کے نام سے جو الرّحمٰن اور الرّحیم ہے۔
ہر طرح کی ستایش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے،
جو رحمت والا ہے؛ اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے
مالا مال کر رہی ہے؛ جو اس دن کا مالک ہے، جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں
کے حصّے میں آئیگا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو
ہی ہے، جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر
سعادت کی سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے
انعام کیا۔ ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے۔ اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

اس عبارت پر ترجمہ کا گمان ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصنف نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اسے اصل میں لکھا ہی اس طرح ہو۔

ہمارے پرانے مترجمینِ قرآن نے دین کی جو خدمت کی، اور جس طرح سے قرآنی علوم کو عوام تک پہنچایا، اس کی قدر و قیمت کو کسی طرح کم کرنا مقصود نہیں، نہ ہم ان پر کوئی اعتراض ہی کرتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے ترجمے کی صحیح قدر و قیمت اور اصلی خوبی اسی وقت واضح ہوتی ہے، جب اس کا بعض دوسرے ترجموں سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے۔ اس سے پہلے ہمارے بیشتر مترجموں نے قرآنی آیات کا لفظی ترجمہ اسی ترتیبِ الفاظ سے کر دیا، جس طرح وہ قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسے اردو ادب کا حصّہ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بیشتر اردو محاورے اور روزمرّے، بلکہ صرف و نحو تک کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تراجم آسانی سے مہیا ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان تراجم کو اردو نثر کی

Marfat.com

ارتقائی تاریخ میں مثالاً پیش کرسکتے ہیں، لیکن ادب کا حصّہ قرار نہیں دے سکتے۔
قرآن کے یہ لفظی ترجمے ہی تھے، جنھوں نے ملاّ رموزی کو "گلابی اردو" ایجاد کرنے کی راہ پر لگایا۔

بائبل کا انگریزی ترجمہ آج تک انگریزی ادب کا وقیع حصّہ اور مسلّمہ نمونہ ہے۔ اردو میں یہ شرف صرف ترجمان القرآن کو دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ مولانا آزاد اسے مکمل نہ کرسکے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بھی وہ کانگریس کے صدر تھے۔ کانگریس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں "ہندستان چھوڑدو" (QUIT INDIA) کی قرارداد منظور کی، تو اگلی صبح متعدّد دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ وہ بھی گرفتار کرلیے گئے۔ اس قافلے کے بیشتر افراد دکن کے مشہور تاریخی قلعے احمدنگر میں نظر بند کیے گئے تھے۔ مولانا اسی گروہ میں تھے، یہ لوگ تین برس کے لگ بھگ یہاں رہے۔ نظر بندی کے دوران میں انھوں نے اپنے صدیقِ دیرینہ نواب صدر یار جنگ، مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی (مرحوم) کے نام چند خطوط لکھے۔ چوں کہ قیدیوں کے تمام تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع کردیے گئے تھے۔ اور خط وکتابت کی اجازت نہیں تھی، اس لیے ان خطوں کے ڈاک سے بھیجنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ "ذوقِ خامہ فرسائی" کی تسکین کے لیے وہ خط لکھتے اور اسے محفوظ رکھ دیتے۔ جب ۱۹۴۵ء میں رہا ہوئے تو بعض احباب کے اصرار پر انھوں نے یہ ۱۶ خط "غبارِ خاطر" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کردینے کی اجازت دے دی۔

مولانا کی نگارش کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا اسلوبِ تحریر موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر موضوع ہلکا پھلکا ہے تو ان کی تحریر میں شعروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ خدا جانے ان کے حافظے میں اردو فارسی کے کتنے شعر محفوظ تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے ان شعروں کو اپنی تحریر میں کھپاتے چلے جاتے۔ اگر موضوع دینی ہوا تو شعروں کا کام بالعموم قرآن کریم کی آیتوں سے

ے غالباً ہماری نئی نسل کو ملاّ رموزی اور "گلابی اردو" کا نام بھی معلوم نہیں ہوگا۔

Marfat.com

لیا جاتا۔ اگر موضوع فلسفیانہ اور تاریخی ہے، تو آپ کو نہ شعر ملینگے نہ آیاتِ قرآنی، بلکہ شروع سے آخر تک مسلسل اور مدلّل گفتگو صغریٰ وکبریٰ سے متعلق ہوگی۔ البتہ موضوع کچھ ہو آپ ایک چیز ہر جگہ موجود پائینگے۔ یہ ہے زبان کی شگفتگی اور رنگینی۔ جیسا کہ میں نے لکھا، ان کے ہاں تکرار اور اطناب بہت ہے۔ جو بات چند فقروں یا زیادہ سے زیادہ چند سطروں میں لکھی جاسکتی ہے وہ اس سے متعلق بھی آسانی سے دو چار صفحے لکھ جاتے ہیں۔ عام حالت میں ایسی تحریروں سے پڑھنے والے کو اکتا جانا چاہیے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ قاری ان کی تحریروں میں کچھ ایسا گم ہوجاتا ہے کہ اسے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار پڑھ رہا ہے۔ یہ حقیقت میں تحریر کی رنگینی اور شگفتگی، ان کے اسلوب کی دلکشی اور حسن کا اعجاز ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن تحریر کی زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں میں اس درجہ گم ہوجاتا ہے کہ اُسے اِس میں تکرار کا احساس بھی نہیں ہوتا بلکہ جب مضمون یا کتاب ختم ہوتی ہے تو اسے اس افسوس کے ساتھ ہاتھ سے رکھنا پڑتا ہے کہ کاش یہ کچھ اور طویل ہوتی۔

اردو کو یہ اور شرف حاصل ہے کہ انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل اپنی آخری پبلک تقریر بھی اسی کی حمایت میں کی۔ ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کی سہ پہر کو لال قلعے اور جامع مسجد دہلی کی تاریخی عمارتوں کے درمیانی میدان میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کل ہند اردو کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد مولانا نے کوئی دس منٹ کے قریب حاضرین کو خطاب کیا اور اپنی روایتی صاف گوئی سے اردو کے مسئلے پر گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہوا تھا، اردو اور ہندی ایک دوسرے کی مخالف اور حریف زبانیں خیال کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک اس بات کی دعویدار اور امیدوار تھی کہ اسے ملک بھر کی زبان بننے کا موقع دیا جائیگا۔ اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دونوں کے حامی اور علمبردار اپنے اپنے دلائل پیش کرتے تھے اور حکومت اور عوام سے مدد بھی چاہتے تھے۔ لیکن اب حالات بدل گئی ہے۔ ملک آزاد ہوچکا ہے اور ہم نے پورے غور وخوض کے بعد ایک دستور بنالیا ہے۔ دستور نے فیصلہ کر دیا کہ آیندہ ملک بھر کی سرکاری زبان دیوناگری رسم خط میں لکھی ہوئی ہندی ہوگی۔ ہم نے یہ دستور منظور

Marfat.com

کر لیا ہے اور اس کا یہ فیصلہ بھی کہ ہماری زبان ہندی ہوگی. اس لیے اب آزادی سے پہلے کا وہ سوال کہ ملک کی زبان ہندی ہو یا اردو ختم ہوگیا۔ ہم نے یہ جگہ ہندی کو دے دی. اس لیے اب ہم اردو کے حق میں یہ آواز نہیں اُٹھا سکتے، نہ اُٹھاتے ہیں کہ اسے پورے ملک کی، ہندستان بھر کی، سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ اب اردو ملک کی چودہ علاقائی زبانوں میں سے ایک ہے۔ دستور نے اس کی یہ حیثیت تسلیم کرلی ہے (دفعہ ۳۴۷)۔ اب اردو بھی بنگالی، مرہٹی، گجراتی، ملیالم اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرح ایک علاقے، ایک خطے کی زبان ہے۔ اردو کے حامیوں کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس کا جو حق دستور نے تسلیم کیا ہے اسے اس کے علاقے میں نافذ کیا جائے۔

یہ تھا ان کی تقریر کا لب لباب۔ اردو کا علاقہ جیسا کہ ہر ایک معلوم ہے دہلی، اترپردیش، بہار اور پنجاب ہے۔ اردو دوستوں کا مطالبہ یہ ہے کہ جو سہولتیں بنگالی کو بنگال میں، گجراتی کو گجرات میں، ملیالم کو کیرالا میں، تمل کو مدراس میں حاصل ہیں، اردو کو ان جگہوں پر حاصل ہونا چاہیں۔

اس تقریر کے بعد مولانا کو منظرِ عام پر آنا نصیب نہ ہوا. چار دن بعد ۲۰ فروری کی صبح کو اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا. تین دن غشی کی کیفیت طاری رہی. جہاں تک انسانی مساعی کا دخل ہے، کوئی کمی نہیں کی گئی. لیکن موت کا کیا علاج! آخر ۲۲ فروری کی علی الصباح انھوں نے جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ ان کی موت سے ہندستان کی جنگِ آزادی کا ایک نڈر سپاہی، صفِ اوّل کا سیاستدان، علومِ قدیمہ و جدیدہ کا بےنظیر جامع، ایک شعلہ بیان خطیب اور مقرر، اردو کا بےمثال نثر نگار ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

Marfat.com

تحریکِ آزادی کی مذہبی بنیاد

(افکارِ آزاد کی روشنی میں)

خاندانی روایت کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیم سراسر اسلامی علوم و فنون تک محدود رہی تھی۔ ذریعۂ تعلیم عربی اور فارسی تھا۔ انگریزی پڑھانے کا کوئی انتظام کیا گیا۔ نہ انھوں نے یہ زبان پڑھی۔ خاندان کی جو فضا تھی' اور مولانا خیرالدین کے جو بے لچک معتقدات تھے' ان کی رو سے انگریزی کافروں کی زبان تھی۔ اور اس کا پڑھنا یا پڑھانا کفر کے مرادف تھا۔ البتہ بعد کو مولانا آزاد نے خود محسوس کیا کہ انگریزی کے بغیر علوم جدیدہ کی ترقیوں اور عالمی حالات سے متعلق کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے اپنے طور پر انگریزی پڑھنے کا انتظام کیا۔ اور محنت اور مزاولت سے اس میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ بآسانی انگریزی کتابوں سے استفادہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

خاندانی پس منظر اور اس تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شروع ہی سے ان کا مزاج علمی بن گیا اور اس میں بھی رجحانِ طبع زیادہ تر تصنیفی اور صحافتی رہا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے ابتدائی ۲۰-۲۵ برس صحافت کی وادی ہی میں بسر ہوئے۔ لیکن وہ کہیں بھی رہے ہوں' اسلام اور قرآن' جو تمام اسلامی علوم کا منبع اور مخزن ہے' ہمیشہ ان کے غور و فکر کا محور رہا۔ قرآن ہی ان کی تحریر و تقریر اور گفتار و کردار کی کسوٹی تھا۔ وہ تمام مسائل کو اسی کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ سیاست کی (یعنی جو چیز عرفِ عام میں سیاست کہلاتی ہے) ان کے

Marfat.com

لائحۂ عمل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس میدان میں داخل ہوئے۔ اور پھر اس حد تک اس کے ہو کے رہ گئے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد تو علم و ادب کا مشغلہ کوئی بھولی بسری کہانی ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں وہ بھی اپنے بعض دوسرے سیاسی احباب کے ساتھ قلعۂ احمد نگر میں نظر بند کیے گئے، تو یہاں کے قیام کے دوران میں انھوں نے چند مضامین اور خطوط قلمبند کیے، جو ان کی ۱۹۴۵ء میں رہائی کے بعد "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان بیس برسوں کا ثمرہ لے دے کے یہی ایک کتاب ہے۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔ اس سے ان کا اصلی مقصود مسلمانوں کو ان کے گمشدہ مقام کی یاد دلانا اور انھیں اس پر واپس کھینچ بلانا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جمعیۃ العلمار ہند کے اجلاس لاہور (۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء) کے خطبۂ صدارت میں تفصیل سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں[1]:

> مسئلۂ احیاے ملّت کا مقصود واضح ہے۔ یعنی مسلمانوں کو موجودہ پستی و ادبار سے نکالنے اور ان کے عزّ و اقبال کو واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہییں! اور راہِ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے! اس بارے میں تین مختلف مذاہبِ اصلاح ہیں، جو ہندستان، مصر، ٹرکی، ایران، ٹیونس اور بلادِ ترکستان و قفقاز کے داعیانِ اصلاح نے اختیار کیے ہیں۔
>
> پہلا مذہب وہ ہے، جسے "اصلاح افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں۔ گذشتہ صدی یورپ کے تمدّن و صنائع کے ظہور و اعلان کا عہد تھا... جب یورپ کے تمدّن کا ہوشربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بینقاب ہوا تو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مترتّب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت و جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیّر کی طرف نظر ہی نہ اُٹھائی۔

---

[1] خطباتِ آزاد (ساہتیہ اکادیمی ایڈیشن) ۱: ۱۰۸-۱۱۰

Marfat.com

لیکن ایک جماعت اربابِ بینش وخبر کی بھی تھی، جس نے فوراً تغیرِ احوال محسوس کیا.... لیکن وہ بہ اوّل نظر مرعوب و مسحور ہوگئی۔ اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہوگئے۔ ہندستان میں سرسید احمد خان مرحوم، اور ان کے متبعین و مقلدین .... وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔

دوسرا مذہب "اصلاحِ سیاسی" کا مذہب ہے۔ یہ وہ جماعت ہے، جس .... کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے.... ممالکِ اسلامیہ میں اس مذہبِ اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سیّد جمال الدّین اسد آبادی تھے...

تیسرا مذہب اصلاح "اصلاحِ دینی و اسلامی" کا ہے۔ اگرچہ اس مذہب کے دُعاۃ بمقابلۂ مذاہبِ سابقہ قلیل رہے۔ مگر فی الحقیقت مسئلۂ اصلاح میں یہی گروہ اصحابِ رُشد و ہدایت اور سالکینِ جادۂ اقتصاد و حق کا رہا ہے.... زمانہ روز بروز ان کی دعوت سے قریب‌تر ہوتا گیا۔ اس آخری مسلکِ اصلاح کی بنیاد، جن مبادی و مقدمات پر تھی، انہی کی دعوت و تبلیغ کے لیے، ۱۹۱۲ء میں، میں نے الہلال جاری کیا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ "الہلال" کے اجرا کی علّتِ غائی "اصلاحِ دینی و اسلامی" تھی۔ لامحالہ اس امر کی بنیاد قرآن اور سنّت پر رکھی گئی۔ اس کے لیے انھوں نے برادرانِ اسلام کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا (اور خود بھی اس پر عمل کیا)، جس کا حکم انھیں قرآن نے دیا تھا۔ فرمایا:[۲]

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی

۲۔ آل عمران ۳: ۱۰۴ (متن میں ہر جگہ اردو ترجمہ حتی الوسع "ترجمان القرآن" سے لیا گیا ہے۔

Marfat.com

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥

ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے، اور بیشک ایسے ہی لوگ ہیں جو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اور پھر قرآن نے اس کے مالہٗ اور ماعلیہ کا اضافہ کرکے زیادہ تاکید سے اس حکم کا اعادہ کیا:[۳]

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ٥

(مسلمانو!) تم تمام اُمتوں میں بہتر اُمت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر (سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لاتے، تو یہ ان کے لیے بہتری کی بات ہوتی۔

پہلی آیت (۳ : ۱۰۴) میں حکم ہے کہ تم میں ایک جماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والی ہمیشہ موجود رہے، تاکہ جو لوگ لاعلمی کے باعث یا کسی وقتی خوف اور طمع کے نتیجے میں صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں، انھیں راہِ راست پر واپس لایا جا سکے۔ مسلمانوں نے جب اس حکمِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا، اور اپنے فرائضِ منصبی سے روگردانی کی، تو وہ فوز و فلاح سے بھی محروم ہو گئے، جو اسی حکم کی پابندی کا نتیجہ تھا (وَ اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)

دوسری محولہ فوق آیت (۳ : ۱۱۰) اور بھی زیادہ اہم بلکہ بنیادی ہے۔ اس میں انھیں خَیْرَ اُمَّۃٍ کا خطاب ہی اس باعث دیا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والے ہیں۔ اگر شرط ساقط ہو جائے تو مشروط کا کیا محل! بلکہ اسی میں اسے ایمان باللہ سے وابستہ کر دیا کہ اس حکم کی تعمیل تمھارے ایمان باللہ کا تقاضا ہے۔

قرآن نے متعدد مقامات پر بار بار یہ حکم دہرایا ہے۔ صرف ایک اور آیت ملاحظہ ہو:[۴]

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ

اور جو مرد اور عورتیں مومن ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے

۳۔ آل عمران، ۳ : ۱۱۰
۴۔ التوبہ، ۹ : ۷۱

Marfat.com

بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۝

ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم رکھتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور (ہر حال میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحمت فرمائے گا۔

یہاں مومن مردوں اور عورتوں کے فرائض گنوائے ہیں۔ ان میں صلات اور زکات اور اطاعتِ اللہ و رسول سے بھی پہلے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے اور ان سب اعمال کو رحمتِ الٰہی کے جلب اور جذب کرنے کی علت قرار دیا ہے۔ کیا اس حکم کی اہمیت کی اس سے بڑی ترغیب ہو سکتی ہے!

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حکم کسی خاص شعبۂ زندگی کے بارے میں ہے، یا اس کا اطلاق عام ہے!

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ اسلام نے زندگی کو مختلف شعبوں اور خانوں میں تو ضرور تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک پوری زندگی اکائی ہے، اور اس کا مقصد صرف رضائے الٰہی (مرضاۃ اللہ) کا حصول ہے۔ آپ کوئی کام کریں ــــ ذاتی ہو یا اجتماعی: عرفِ عام میں یہ دینی ہو کہ دنیوی؛ اس کی تکمیل کے لیے، آپ جو وسائل چاہیں استعمال کریں؛ آپ کا فوری مقصود کچھ بھی ہو۔ ہر حال میں نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہونی چاہیے۔ یہی اُقُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[5] کا اقتضا ہے۔ گویا "میری نماز، میرا حج، اور میرا جینا، اور میرا مرنا ــ (غرض سب کچھ) اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"۔ پس، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اس حکم کا نفاذ بھی اسی مقصدِ حیات کی روشنی میں ہوگا۔ "معروف" اور "منکر" کا فیصلہ اور نتیجتہً ایک کے کرنے کی اور دوسرے سے اجتناب کی ہدایت دینے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا اس کے مطابق عملِ حیات، انسانی کے اس ہمہ گیر نصب العین کے حصول میں معاون

۵۔ الانعام ۶: ۱۶۲

Marfat.com

ہوگا یا نہیں!

مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا، تو سب سے پہلے اسی اصول (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے اس کی جلد اوّل میں سلسلہ وار تین مضمون شائع کیے[۶]۔ اور اس حکم پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا[۷]۔

حاصلِ سخن یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہی کر سکتا ہے، جو ایمان باللہ میں راسخ اور مستقیم ہو۔ اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ محبتِ الٰہی کی راہ میں مستقیم ہو کر سب کو خدا کے لیے اختیار کرے اور سب کو خدا کے لیے چھوڑ دے۔ خود اس کی کوئی ذاتی محبت اور ذاتی عداوت نہ ہو۔ نہ اپنی غرض کے لیے دوست بنے، اور نہ اپنی غرض کے لیے دشمن۔ وہ ہر شے کو خدا کی آنکھ سے پیار کرے، اور اُسی کی آنکھ سے دشمن کو دیکھے۔ اس کا کوئی وجود، اس کی کوئی زندگی، اس کی کوئی صدا نہ ہو۔ جب چلے تو خدا کے پانو سے چلے، اور جب سُنے تو خدا کے کان سے سُنے، اور جب بولے تو خدا کی آواز اس کے گلے سے نکلے۔

تو یہ ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مدّعا اور مقصد اور نتیجہ۔

(۲)

اسی لیے انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کا دائرہ وسیع کر کے مسلمانوں کو سب سے پہلے جہاد کی طرف توجہ دلائی۔ جہاد کے لغوی معنی کسی کام میں سعیِ بلیغ کرنے کے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں دشمن کے خلاف (خاص طور پر دفاعی جنگ میں) ہتیار سے جنگ کرنے کے۔

۶- الہلال، جلد اوّل: شمارہ ۵، ۶، ۷

۷- الہلال، ۱: ۷ (۲۰ر اگست ۱۹۱۲ء) ص ۱۲

Marfat.com

۱۸۵۷ء کی مسلّح کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے حالات ہندُستان کی تاریخ کا خونیں باب ہے۔ اور ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب انگریزوں کا دلّی پر دوبارہ قبضہ ہوگیا، تو انھوں نے انتقاماً ہندُستانیوں پر وہ مظالم توڑے کہ ان کے محض سننے سے جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں بیگناہ مَوت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اور جو بچ گئے، ان کی جادادیں ضبط کرکے نیلام کردی گئیں۔ یوں بیسیوں کھاتے پیتے گھرانے مٹی میں مل گئے اور ان کے مرد و زن جان و ناموس بچانے کی خاطر برسوں آوارہ گردی اور بیوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئے۔

مسلمان خاص طور پر اس عتاب کا شکار ہوئے تھے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی بعض علما نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ اور پھر تھوڑی مدّت بعد آخری تاجدارِ خاندانِ مغلیہ بہادر شاہ ثانی (ظفر) کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی لیے جب انگریزوں نے دیسی سپاہ پر فتح حاصل کرلی، تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ قائم ہوا۔ اس غریب کو بغاوت کا مجرم قرار دے کر رنگون جلاوطن کر دیا اور جو مسلمان عمائد یہاں تھے، اُنھیں بیدست و پا کرنے کے لیے ہر طرح کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔

سرسیّد احمد خان مسلمانوں کی اس زبوں حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کا دوہرا علاج تجویز کیا۔ اوّل یہ کہ مسلمان آیندہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی اقدام میں حصّہ نہ لیں۔ دوسرا، مثبت قدم یہ اُٹھایا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرکے زندگی کی دوڑ میں برادرانِ وطن کے معیارِ ترقی تک پہنچیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے ہمخیالوں نے اس دوسرے نسخے (خاص طور پر اس کے پہلے جُز کو) مستقل اور دائمی علاج کا درجہ دے دیا۔

چونکہ ہنگامے کے آغاز میں مسلمان علما نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا، انگریزوں کو اس لفظ سے ایسی چڑ ہوگئی کہ وہ خیال کرنے لگے کہ مسلمان کی فطرت میں بغاوت ہے، اور وہ مذہباً کسی کا ماتحت یا رعایا بن کر نہیں رہ سکتا۔ سرسیّد نے یہ داغ دھونے کے لیے "جہاد" کی طرح طرح کی تاویلیں کرکے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام میں تلوار کے جہاد کا حکم ہے ہی نہیں؛ اور ہتیار کے صرف بہت استثنائی حالت میں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

Marfat.com

اسی کے ساتھ انھوں نے انگریزی حکومت کی نعمتوں اور برکتوں پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ انھیں دل وجان سے حکومت کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔
اس طریقۂ استدلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی، تو حال آنکہ اس میں حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں تھی، سرسید نے مسلمانوں کو اس میں عدم شمولیت کا مشورہ دیا۔
مسلمان اس وقت واقعی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ حکومت کو نہ صرف ان پر اعتماد نہیں تھا، بلکہ وہ ان کے خلاف تھی۔ ملک کی بھاری اکثریت بھی زندگی کے ہر میدان میں ان سے کہیں آگے تھی۔ قدرتاً وہ پریشانی میں ہرطرف ہاتھ پانو مار رہے تھے۔ یہ صورتِ حال تھی کہ ان کے کانوں میں سرسید کی یہ آواز پہنچی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انھوں نے اسے بہت غنیمت خیال کیا۔ ادھر سرسید اور ان کے رفقاے کرام نے اس زور شور سے پراپگنڈا کیا کہ اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا بھی، تو وہ نقارخانے میں طوطی کی آواز بن کے رہ گیا۔ غرض، سوادِ عظم کو یقین ہوگیا کہ اُن کی تمام مصیبتوں کا علاج سرسید کے تجویز کردہ نسخے ہی میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس پر آمنّا وصدّقنا کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور آنکھیں بند کرکے ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چل پڑے۔
سرسید کا مارچ ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوگیا۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کو جو نصیحت کی تھی، وہ گویا مسلمانوں نے ہمیشہ کے لیے پلّے باندھ لی۔ ادھر سرسید کے جانشینوں نے بھی اس میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس کی، نہ اس کے خلاف ہی کچھ کہا۔
یہ تھی صورت حال جب مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال منصۂ شہود پر آئے۔
مولانا آزاد نے سرسید کی تعلیمی پالیسی سے اتفاق کیا۔ لیکن ان کی سیاسی پالیسی کی پُرزور تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ قرآن فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲: ۴۰) حکومت اللہ کے سوا کسی اور کا حق نہیں۔ لہٰذا مسلمان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا فرمانبردار نہیں ہوگا۔ اس نصّ کی موجودگی میں وہ کسی دوسرے کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ مسلمان تو پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ اس رُوئے زمین پر خداے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی حکومت قائم

Marfat.com

کرے اور اس نصب العین کے حصول کے لیے جہاد کرے۔ وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲ : ۷۸) "اور اللہ کی راہ میں جان لڑادو، اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے، پوری طرح ادا کرو۔" مولانا آزاد نے متواتر لکھا کہ قرآن کے ان صریح احکام کی موجودگی میں سرسید کا یہ کہنا کہ انگریزوں کے دل و جان سے فرمانبردار رہو اور تلوار کا جہاد ترک کردو، کیونکر گردانا جا سکتا ہے! سرسید کی یہ تلقین سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے اور اسی لیے ناقابلِ تسلیم و تقلید۔ انھوں نے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ انھوں نے جب سے اس حکمِ الٰہی کو ترک کیا ہے، تنزل اور ادبار نے ان کا گھر دیکھ لیا ہے۔

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلانے کے لیے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب یورپی استعماری طاقتیں خلافت عثمانیہ کے خلاف رزم آرا تھیں، مشرق میں بلقان کے محاذ پر جنگ ہو رہی تھی، اور مغرب میں طرابلس میں۔ مولانا آزاد نے دونوں محاذوں کی تصاویر حاصل کرنے کا خاص انتظام کیا۔ یہ ہر ہفتے جنگ کے تفصیلی حالات کے ساتھ الہلال میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ اسلامی جرنیلوں کی تصویریں اور ان کے حالات بھی چھپتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ ان حالات اور تصویروں سے ہندستانی مسلمانوں کو غیرت آئے، اور انھیں معلوم ہو کہ ان کے دینی بھائی کس طرح دشمنوں کے خلاف جہاد میں مشغول ہیں، جب کہ وہ غیروں کی غلامی پر قانع آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

مولانا آزاد نے جہاد کا صور اس بلند آہنگی سے (اور اس تواتر سے) پھونکا کہ لوگ سوتے سے چونک اٹھے۔ بڑے بڑے علما نے اعتراف کیا کہ ہم اسلام کے اس بنیادی اصول اور حکم کو بھلا چکے تھے؛ مولانا آزاد نے ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا علم و فضل اور مقامِ دعوت و عزیمت کس سے مخفی ہے! پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے بعد راجا مہندر پرتاپ کی صدارت میں ایک متوازی حکومت ہند افغانستان میں قائم ہوئی تھی۔ یہ شیخ الہند ہی کے ایما پر ہوا تھا۔ "ریشمی رومال" کی تحریک بھی انھیں کا کارنامہ تھی۔ تو خیر، ان سے متعلق مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں[۸]:

۸۔ برہان، دلی (جون ۱۹۸۰ء) : ۵۰۴

Marfat.com

جب ایک مرتبہ کسی نے کہا: "حضرت آپ الہلال، اس ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، حال آں کہ اس میں تصاویر ہوتی ہیں۔ اور اس کا ایڈیٹر، مولانا ابوالکلام آزاد متشرع بھی نہیں۔ تو حضرت شیخ الہند نے فوراً یہ شعر پڑھا:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے، تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

اور پھر فرمایا:

"میں الہلال کیوں نہ پڑھوں کہ یہ پہلا رسالہ ہے، جس نے ہم کو جہاد کا سبق یاد دلایا ہے، جو ہمارا فریضہ تھا اور ہم اسے بھول چکے تھے۔

مختصراً الہلال کا سیاسی مقصد دوگونہ تھا:

(۱) سرسید احمد خان کی انگریز دوستی کی پالیسی غلط اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

(۲) ہندو مسلم یک جہتی: دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو برادرانِ وطن کے ساتھ ملک کی آزادی کے حصول کے لیے تعاون کرنا چاہیے۔

کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ سب باتیں خلافِ مصلحت ہیں۔ اور ان کے درست ہونے کا کوئی ثبوت یا دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ اگر مسلمانوں نے یہ روش اختیار کی تو گویا وہ ہندو "اکسٹریمسٹوں" کے ساتھ مل گئے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ اگر ملک انگریزوں کے چنگل سے آزاد بھی ہوگیا، تو مسلمان آزاد نہیں ہونگے بلکہ ہندو اکثریت کے غلام بن جائینگے۔ وہی آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا والی مثل ان پر صادق آئیگی۔

مولانا آزاد نے کہا کہ میں یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہ رہا ہوں، بلکہ قرآن کہتا ہے:[۱۰]

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا، جو

۱۰۔ سورۃ الممتحنہ، ۶۰: ۸-۹

Marfat.com

يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور جنھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے تمھیں منع کرتا ہے، جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور جنھوں نے تمھیں گھروں سے نکالا اور نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی۔ جو کوئی ایسے لوگوں سے دوستی کریگا، وہ گنہگار ہونگے۔

مولانا آزاد نے ان آیات کی بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر ان پر مختلف مقامات پر لکھا ہے۔ سب سے مفصل بحث اُن کے مجلسِ خلافت کے اجلاسِ آگرہ کے خطبۂ صدارت میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں[۱۱]:

> قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں... ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنھوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں؛ ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں؛ ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلا شبہہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرلیے جائیں۔ اور قرآن مجید کا

۱۱۔ خطباتِ آزاد، ۱: ۴۷-۴۸

Marfat.com

یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے، جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اس عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں، جو محبت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو۔

اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے، نہ مسلمانوں کو ان کی آبادی سے نکالا ہے، اگر مسلمان ایسے نامسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں، ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک وہ کر سکتے ہیں، کریں.... مسلمان بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبت، اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتا، جو ان کی دشمن ہوں۔

اس کے بعد انھوں نے زیادہ تفصیل سے بیان کیا کہ گذشتہ کئی برس سے انگریزوں نے اسلامی ممالک کے خلاف جو رویہ اختیار کر رکھا ہے ۔ عراق، ایشیا ۔ کوچک، قسطنطیہ اور خود ہندستان میں جو کچھ انھوں نے کیا ہے، اور کر رہے ہیں، اس سے ثابت ہے کہ وہ اس قرآنی حکم (اور مزید گیارہ آیات قرآنیہ) کی رُو سے "فریق محارب" کا درجہ رکھتے ہیں۔ پس اس صورت میں

مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہوگیا، فسق ہوگیا اور نفاق ہوگیا مسلمانوں کے لیے یہ قریب قریب کفر ہوگیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت، وفاداری اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھینگے، تو ایک منٹ کے لیے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔[۱۲]

۱۲۔ ایضاً : ۱ : ۴۹

Marfat.com

یہ تھا ان کا جواب، مندرجہ صدر پہلی شق یعنی انگریز دوستی سے متعلق۔ دوسری شق یعنی ہندوؤں سے تعاون اور ملک کی جنگِ آزادی کے بارے میں ان کا رویّہ اور بھی صریح اور فیصلہ کن تھا۔ فرمایا:[۱۳]

اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندستان کی نجات کے لیے، ہندستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔

... ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر، حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انھوں نے اہلِ مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود سرورِ کائنات نے عملاً پیش کیا ہے۔ اور عملاً و حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں، اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہٖ اس کے الفاظ ہیں: اِنَّہٗ اُمَّۃٌ واحدۃٌ
ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں،

۱۳۔ ایضاً: ۱: ۵۰-۵۱

Marfat.com

اتفاق کرتے ہیں۔ اور ہم سب مل کر ایک اُمّۃٌ واحدۃٌ بننا چاہتے ہیں۔ اُمّۃ کے معنی ہیں قوم اور نیشن، اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

یہ اشارہ ہے، اس معاہدہ کی طرف جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے پر وہاں کے یہودیوں سے کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ مکّہ کے قریش اور مشرک انھیں اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کو مدینہ میں چین سے نہیں بیٹھنے دینگے، اور ضرور ان کا پیچھا کرینگے۔ اس لیے انھوں نے پیش بندی کے طور پر مقامی آبادی یہود سے (جو غیر مسلم تھے) ایک معاہدہ کیا۔ یہ ایک دستاویز ہے اور تاریخ نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے[۱۴] (جس کی طرف مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا الکتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلّمَ بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب ومَن تبعھم، فلحقَ بھم وجاھد معھم انّھم اُمّۃٌ واحدۃٌ من دون الناس.... الخ

اس معاہدے میں دو فریق تھے، مکّے کے مہاجر اور مدینہ کے انصاری مسلمان، اور مدینے کے یہودی اور ان کے حلیف۔ معاہدے میں فریقین کو ایک اُمّۃ یعنی قوم (نیشن) تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت ان سب کو مکّہ کے غیر مسلم اور مشرک قریش کے حملے کا اندیشہ اور خطرہ تھا؛ دونوں فریق اس کا مقابلہ کرنے کے لیے متفق ہو گئے؛ اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مشترک دشمن کے خلاف ایک قوم ہیں۔ مولانا آزاد نے اس سے یہ استدلال کیا کہ ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی انگریزوں کے مقابلے میں وہی پوزیشن ہے، جو مدینے کے مسلمانوں اور یہودیوں کی قریشِ مکّہ کے مقابلے میں تھی۔ پس، اگر وہ اپنے تمام مذہبی

۱۴۔ سیرۃ النبویہ (ابن ہشام) ۲ : ۱۴۷

Marfat.com

اور تمدّنی اختلافات کے باوجود مشترک دشمن کے مقابلے میں ایک قوم ہو سکتے تھے، تو آج ہندُستان کے باشندوں کو ایک قوم کہلانے اور بننے میں کیا مانع ہے! بلکہ اتباعِ سنّت کے باعث یہ مسلمانوں کا فرض ہے۔

پھر اس مسئلے پر زیادہ زور دینے کے لیے کہا[۱۵]:

> میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں، تو وہ یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہندستان کے اُن انسانوں میں ہوں جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بُلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پالیسی مسلّمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیٰحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشّان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں۔ تو اُن کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں، اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ہندو مسلم اتحاد کا اصول تمام ہندستانیوں کا ایمان بن گیا۔ اس کے نتائج ہم سب کے سامنے ہیں۔

انگریزی حکومت مولانا آزاد اور الہلال کی ان سرگرمیوں سے غافل نہیں تھی، نہ اسے ان کے نتائج کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو سکتی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا آزاد کو کلکتہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس پر وہ رانچی (بہار) پہنچے اور اس کے مضافات میں مورآبادی بستی میں مقیم ہو گئے۔ جولائی (۱۹۱۶ء) میں حکومت نے انھیں وہیں نظر بند کر دیا، تاکہ وہ کسی اور جگہ منتقل نہ ہو سکیں۔

۱۵- خطباتِ آزاد، ۱ : ۵۴

Marfat.com

اس نظر بندی سے وہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں رہا ہوئے۔

(۳)

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے خاتمے کے قریب شمالی ہند میں سیاسی بےچینی اپنے پورے شباب پر تھی۔ دلّی اور پنجاب خاص طور پر اس سے بہت متاثر تھے۔ مخالفت کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ حکومت نے اُسے کچلنے کے لیے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ گاندھی جی جنوبی افریقا سے ہندستان واپس آ چکے تھے اور انھوں نے اپنا ستیاگرہ کا تجربہ یہاں نیا نیا رائج کیا تھا۔ ۴ مارچ ۱۹۱۹ء کو انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کریں۔

دلّی کی مرکزی حیثیت مسلّمہ تھی۔ یہاں سوامی شردھانند اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان ہمارے سیاسی لیڈر تھے۔ ان دنوں گاندھی جی بھی یہیں دلّی میں مقیم تھے۔

۳۰ مارچ کو دلّی میں ہڑتال بہت پُرامن طریقے پر شروع ہوئی۔ لیکن حکومت اور نوکر شاہی غافل نہیں تھی، بلکہ اپنے ہتکنڈوں سے پورے طور پر لیس تھی۔ فساد بہت معمولی بات پر شروع ہوا۔ دلّی ریلوے اسٹیشن پر ستیاگرہیوں نے ایک حلوائی سے دکان بند کرنے کو کہا۔ اس پر فوراً پولیس نے مداخلت کی اور کچھ ستیاگرہیوں کو حراست میں لے لیا۔ قدرتاً بھیڑ جمع ہوگئی۔ اس پر فوج بلالی گئی اور فساد شروع ہوگیا۔ فوج نے گولی چلادی۔ بھگدڑ مچنا ہی تھی۔ لوگ کمپنی باغ کے رستے سے بھاگتے ہوئے گھنٹہ گھر (مرحوم) کے سامنے سے چاندنی چوک میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ اور فساد ہوا، اور فوج نے دوبارہ گولی چلائی۔ سرکاری اعلان کے مطابق اُس دن پانچ آدمی موقع پر جاں بحق ہوئے اور چودہ زخمی۔ (ایک بعد کو زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا)

جونہی سوامی شردھانند کو گولی چلنے کی خبر ملی، وہ پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور اس کے بعد چاندنی چوک آ گئے۔ انھوں نے ستیاگرہیوں اور عوام کو سمجھایا بجھایا، اور ہجوم کے ساتھ پیپل پارک کی راہ لی۔ یہاں جلسہ ہوا، جس میں انھوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور انھیں پُرامن اور

Marfat.com

منظّم رہنے کی تلقین کی۔ جلسے کے اختتام پر وہ پیدل اپنے مکان کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ چاندنی چوک سے گزر رہے تھے اور خاصی بڑی بھیڑ ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی کہ سامنے سے ایک فوجی دستے نے اُن کا راستہ روک لیا۔ اس دستے میں تمام سپاہی منی پور کے تھے (اور غالباً یہ دانستہ کیا گیا تھا)۔ چونکہ وہ ہندی سے نابلد تھے، اس لیے وہ سوامی شردھانند یا کسی اور کی کوئی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ اتنے میں، خدا معلوم کیسے، اتفاق سے ایک بندوق چل گئی۔ اس پر بھیڑ مشتعل ہوگئی اور فوجیوں کی طرف بڑھی۔ فوجیوں نے بندوقیں چھنیا لیں۔ قریب تھا کہ وہ فیر کردیں کہ فوراً سوامی شردھانند ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ انھوں نے اپنا سینہ ننگا کرلیا اور فوجیوں سے کہا: لو، اگر گولی مارنا ہے، تو میں حاضر ہوں۔ فوجی جو ہندی نہیں سمجھتے تھے، اس نظارے پر ہکا بکا رہ گئے کہ اب کیا کریں۔ خوش قسمتی سے اسی وقت ایک انگریز افسر موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے بیک نظر حالات کا جائزہ لیا اور فوجیوں کو حکم دیا کہ بندوقیں نیچی کرلیں اور واپس چلے جائیں۔

رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گذشت۔ سوامی شردھانند کی جان بچ گئی۔ لیکن ان کے اس جرأت مندانہ بلکہ متہوّرانہ اقدام نے انھیں چشم زدن میں دلّی کا محبوب ترین اور مقبول ترین لیڈر بنا دیا۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ یہ ایک شخص ہے جو کسی صورت اپنی جان کی قربانی دینے سے نہیں جھجکتا اور سب سے آگے بڑھ کر سینہ تان کر گولی کھانے کو تیار ہے۔

یہ ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا۔ ہر طرف "مہاتما گاندھی کی جے" اور "نعرۂ تکبیر" بیک آواز ہندو مسلمانوں کی زبان پر تھے اور سب شانہ بشانہ آزادی کی جنگ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

اگلے دن (۳۱ مارچ) "شہیدوں" کی یاد میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ سوامی شردھانند نے بھی اس میں تقریر کی۔ ۴ اپریل کو جامع مسجد (دلّی) کی طرف سے اعلان ہوا کہ ظہر کی نماز کے بعد ۳۰ مارچ کے ہنگامے میں مرنے والوں کو خراجِ عقیدت ادا کیا جائے گا۔ اُس دن بعض مسلمان عمائدِ شہر سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ جامع مسجد میں لوگوں سے خطاب کریں۔ چنانچہ سوامی جی جامع مسجد گئے اور وہاں انھوں نے

Marfat.com

نماز کے بعد لوگوں کے سامنے تقریر کی۔

یہ اپنی نوعیت کا غیر معمولی اور نادر واقعہ تھا۔ جامع مسجد میں بھگوے کپڑوں میں ملبوس کسی (غیر مسلم) سنیاسی کا مسلمانوں سے خطاب کرنا ــــ ایسا نہ کبھی اس سے قبل دیکھنے سننے میں آیا تھا، نہ اس کے بعد کبھی ایسا ہوا۔

لیکن اس کے جلد بعد ہی بعض اسلامی حلقوں میں اس کا ردِّ عمل شروع ہوا۔ انھوں نے سوامی شردھانند کی مسجد میں تقریر کرنے کو ناجائز بلکہ سخت فتنہ اور بدعت سے تعبیر کیا اور لکھا کہ اس سے مسجد کی بے حُرمتی ہوئی ہے اور اس کے احترام کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بعض لوگوں نے لکھا کہ "مسلمانوں کو چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کو مقدم رکھیں اور جوشِ اتحاد میں ایسے بیخود نہ ہوجائیں کہ احکامِ شرعیہ سے بے پروا ہوجائیں۔"

معاملہ بنیادی طور پر سیاسی نوعیت کا تھا، اور اس سے بہت دُور رس نتائج مترتب ہونے والے تھے۔ لہٰذا جونہی یہ خبر مولانا ابوالکلام آزاد کو پہنچی جو اُس زمانے میں (جیسا کہ لکھا جاچکا) رانچی میں نظر بند تھے کہ کچھ لوگ سوامی شردھانند کے جامع مسجد میں داخلے اور وہاں تقریر کرنے پر اعتراض کر رہے ہیں اور اسے غیر اسلامی اور خلافِ شریعت فعل سمجھتے ہیں تو اُنھوں نے فوراً ایک مفصّل مضمون قلمبند کیا جس میں اس مسئلے کا اسلامی نقطۂ نظر سے شرح و بسط سے جائزہ لیا۔ یہ مضمون پہلے مشہور علمی رسالے "معارف" اعظم گڑھ میں چھپا[16]، اور اسی زمانے میں الگ سے کتابی شکل میں بھی بعنوان "جامع الشواہد فی دُخولِ غیر المُسلم فی المساجد" شائع ہوا۔

اس میں انھوں نے صدرِ اسلام میں خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعدد واقعات سے استدلال کیا اور بتایا کہ غیر مسلموں کا مسجدوں میں داخلہ کبھی ممنوع نہیں رہا۔ آنحضرت صلعم نے غیر مسلموں بلکہ مشرکوں تک کے وفود سے مسجدِ نبوی (مدینہ) میں ملاقات کی؛ انھیں وہاں ٹھیرایا؛ انھیں مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت دی۔ مثلاً

اوّل۔ یمن میں عیسائیوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ اسلام کی دعوت وہاں پہنچی تو رفتہ رفتہ

۱۶۔ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ شمارہ مئی و جون ۱۹۱۹ء

Marfat.com

مسلمانوں کی ان سے راہ ورسم پیدا ہوگئی۔ بالآخر وہاں کے شہر نجران کے عیسائیوں نے تحقیق کے لیے ۶۰ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مدینہ بھیجا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے، توحسبِ معمول ان کی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مسجدِ نبوی میں ملاقات ہوئی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ وفد کے اراکین نے بات چیت سے پہلے عبادت کرنی چاہی۔ بعض مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ وہ مسجد میں عیسائیوں کے طریقے پر عبادت کریں۔ لیکن آنحضرتؐ نے انھیں اجازت دینے کا حکم دیا۔ اس پر اُن عیسائیوں نے مشرق کی طرف منھ کیا اور نماز ادا کی۔ اس ایک واقعے سے کئی استنباط ہوتے ہیں:

(۱) غیر مسلم مسجد میں داخل ہوسکتے ہیں۔

(۲) غیر مسلم اسلامی مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کا مجاز ہے۔ (مسجد کا مصرف ہی عبادتِ الٰہی کے لیے جگہ مہیا کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں عبادت کرے، بشرطے کہ اس میں شرک یا بُت پرستی کا شائبہ نہ ہو، تو یہ تو مسجد کے عین مقصود کے مطابق ہے)

(۳) اس وفد میں (۶۰) آدمی تھے۔ گویا یہ عبادت (نماز) دو چار آدمیوں کا انفرادی یا پوشیدہ عمل نہیں تھا، بلکہ اچھے خاصے مجمع نے (مسلمانوں کی موجودگی میں) اپنی نماز ادا کی۔

دوم۔ ممکن ہے کہ وفدِ نجران کے عیسائی ہونے سے کسی کو یہ خیال گزرے کہ اہلِ کتاب کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔

فتحِ مکّہ کے بعد ۹ھ میں طائف سے بنو ثقیف کا جو وفد آیا، وہ لوگ مشرک اور بُت پرست تھے۔ وہ نہ صرف مسجد میں آئے، اور اُن سے آنحضرت صلعم کی ملاقات اور گفتگو ہوئی، بلکہ آپ نے انھیں مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت دی، اور اُن کے لیے صحنِ مسجد میں خیمہ نصب کرایا گیا۔

سوم۔ تیسرا واقعہ ثمامہ بن آثال کا ہے، جو مشرک تھا۔ وہ نجد کا رئیس تھا۔ ۵ھ میں

Marfat.com

آنحضرتؐ نے اس کو گرفتار کرا کے مدینہ بلوایا۔ اور یہاں آنے کے بعد اسے مسجدِ نبوی میں ایک ستون سے بندھوا دیا۔ تین دن تک وہ اسی طرح بندھا رہا۔ پھر اسے آپ کے حکم سے بلا شرط رہا کر دیا گیا۔

غرض ان تمام واقعات سے ثابت ہے کہ غیر مسلموں اور مشرکوں کا داخلہ مسجد میں جائز ہے؛ ان کا مسجد میں قیام جائز ہے؛ اور ان کا مسجد میں اپنے طریقے پر عبادت کرنا بھی جائز ہے بشرطے کہ اس میں کوئی عنصر شرک کا نہ ہو۔

ان واقعات کے بیان سے مولانا آزاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے؛ لکھتے ہیں[۱۷]:

> مسجدوں کا احترام یہ ہے کہ اس میں انسانوں کی بھلائی کے لیے انسانوں کا اجتماع ہو۔ اسلام نوعِ انسانی کی عظمت و احترام کے لیے آیا ہے، نہ کہ تذلیل و تحقیر کے لیے۔ پس، وہ کسی انسان کو بہ حیثیت ایک انسان نجس قرار نہیں دیتا، جس کی چھوت سے مٹی اور اینٹ ناپاک ہو جائے
>
> اسلام کی دینی عمارت صرف مسجد ہے اور کوئی نہیں۔ پس اگر اسلام غیروں کو قبول کرنا چاہتا ہے، تو مسجد ہی میں قبول کرنا پڑے گا۔ آج اگر ہمارے ہندو بھائی خود اپنی محبت اور پیار سے ہماری مسجدوں میں آتے ہیں، تو یہ وہ چیز ہے، جس کی خود ہم کو آرزو کرنی تھی۔ اور جس کو اوّل دن سے شروع ہو جانا چاہیے تھا۔

ہماری جنگِ آزادی کی کامیابی کا انحصار ہندو مسلم اتحاد کی مضبوطی اور پایداری پر تھا۔ آج جب کہ ہم یہ سب مراحل طے کر کے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکے ہیں، ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مولانا آزاد کے اس فتوے کا کتنا مثبت اور ہمہ گیر اثر ہوا تھا۔

(۴)

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے شروع ہوتے ہی حکومتِ ہند نے ہندستانی رائے عامہ

۱۷۔ جامع الشواہد : ۲۸-۲۹

Marfat.com

سے استصواب کیے بغیر، بلکہ اس کے خلافِ منشا ہندُستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ انگریز قیصرِ ہند تھا؛ اسے ہم سے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی! اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا، اور حکومتِ کے تمام وسائل اور کل پُرزے اس کے اشارۂ ابرو پر چلنے کو تیّار، اس لیے وہ من مانی کرنے میں آزاد تھا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری جماعتوں کے اکابر کے اعتراض اور احتجاج کی کوئی پروا نہ کی گئی اور ہندستان فریقِ جنگ قرار دے دیا گیا۔

جنگ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی، تو اس وقت فریقِ مخالف صرف جرمنی تھا۔ یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو ترکیا نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اب جرمنی اور ترکیا ایک طرف؛ اور انگریز اور فرانس اور روس ان کے مقابلے میں دوسری طرف تھے۔ اس سے ایک نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ آج تک جنگ جرمنی کے خلاف تھی، جس سے ہندُستانی مسلمانوں کو کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ لیکن اب ترکیا بھی جرمنی کا حلیف بن گیا۔ ہندستانی فوج کا بڑا حصّہ یہاں کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اور ترکیا کا عثمانی سلطان، صرف ترکیا ہی کا حکمران نہیں تھا، بلکہ وہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بھی تھا، اور اس کی یہ حیثیت پوری دنیا کے مسلمانوں کو تسلیم تھی اور اس کا اعلان وہ ہر ہفتے جمعہ کے خطبے میں کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہندُستانی فوج محاذِ جنگ پر جاتی ہے، تو اس کے مسلمان سپاہیوں کو خلیفۂ اسلام کے خلاف بھی جنگ کرنا پڑیگی، جو اسلام کے معتقدات کی رُو سے کسی عنوان جائز اور قابلِ برداشت نہیں تھی۔

مسئلے کا یہ نازک مذہبی پہلو انگریز حکومت سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے بطور پیشبندی حکومتِ برطانیہ کے ایما پر حکومتِ ہند نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے، ترکیا کے جنگ میں شامل ہوتے ہی (۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو) یہ اعلان کیا[۱۸]:

۱۸۔ اس اعلان کا اُلٹا سیدھا ترجمہ "مسئلہ خلافت" (اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دلّی: ص ۳۳۰-۳۳۱) میں بھی چھپا ہے۔

Marfat.com

برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ برطانیہ کو اس کا سخت افسوس ہے۔ دولتِ عثمانیہ کا یہ فیصلہ غلط مشورے کے تحت، اور کسی اشتعال کے بغیر، عمداً ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ہز ایکسلنسی وائسرائے ہند، ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق، عرب کے مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں، جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدّہ بھی شامل ہیں، اعلان کرتے ہیں، تاکہ ہز میجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کے دل میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو :

(۱) اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

(۲) ان مقاماتِ مقدسہ اور بندرگاہِ جدّہ پر برطانوی برّی و بحری طاقت سے کبھی حملہ نہیں کیا جائے گا، نہ انھیں کوئی اور نقصان پہنچایا جائیگا۔

(۳) ان مقاماتِ مقدسہ کو جانے والے زائرین اور حجّاج سے کوئی تعرّض نہیں کیا جائیگا۔

(۴) ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کی استدعا پر فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے۔

حکومتِ ہند نے یہاں اس اعلان کی وسیع اور ملک گیر پیمانے پر اشاعت کا خاص انتظام کیا۔ ہر ایک صوبے کے صدر مقام سے، ضلع سے، بلکہ ہر ضلع اور شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی سرکاری افسر نے یہ اعلان اُن کے سامنے پڑھا (اور غالباً یہ چھوٹے چھوٹے اشتہاروں کی شکل میں تقسیم بھی کیا گیا تھا) مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو یقین دلایا جائے کہ

(۱) یہ جنگ مذہبی نہیں، بلکہ سیاسی (اور دفاعی) ہے۔ حملہ ترکیا نے کیا ہے، انگریزوں نے ترکیا پر حملہ نہیں کیا؛ انگریز صرف اپنے بچاؤ کے لیے، مجبوراً ترکیا کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

(۲) انگریزی حکومت خلیفۃ المسلمین کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ترکی حکومت اور وزارت کے خلاف لڑنے پر مجبور ہو گئی ہے، جنھوں نے عمداً، کسی اشتعال کے بغیر، انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔

Marfat.com

(۳) اسلامی مقاماتِ مقدّسہ (جزیرۃ العرب، جدّہ، عراق وغیرہ) کی حُرمت قائم رہیگی۔ اور انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا جائیگا۔

اس وقت حکومت کو ہندُستانیوں کی (اور مسلمانوں کی) مادّی اور معنوی امداد کی اشد ضرورت تھی، فوج میں بھرتی کے لیے مسلمان سپاہیوں کی اور جنگ جاری رکھنے کے لیے روپے کی اس ضرورت اور مجبوری کے پیشِ نظر حکومت نے یہ وعدہ تو کرلیا، لیکن رہا اس عہد کا ایفا، یہ نہ اس کی نیت تھی، نہ یہ اس کے بس ہی میں تھا۔ اگلے تین چار برس میں مسلسل خلاف ورزیوں سے جس طرح اس اعلان کی مٹّی پلید ہوئی، وہ تاریخ کا المناک باب ہے۔

جرمنی نے پوری تیّاری کے بعد جنگ شروع کی تھی۔ اس لیے ابتدائی مراحل میں اسے ہر میدان میں کامیابی حاصل ہوئی اور انگریزوں اور اتحادی فوجوں کو ہر محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات کی یہ رفتار ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں (بلکہ ۱۹۱۶ء کے آخر تک) مسلسل قائم رہی۔ اس کے بعد امریکا بھی جنگ میں کُود پڑا، اور یوں جرمنی کے خلاف اتحادیوں کا پلّہ بھاری ہوگیا۔ یہ تازہ کمک پہنچ جانے کے بعد اتحادی فوجیں بتدریج پیشقدمی کرنے لگیں۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے یورپ کے وہ علاقے واپس لے لیے، جو پچھلے دو ڈھائی برس میں جرمنی نے فتح کیے تھے۔ حکومتِ ہند کے محولۂ فوق اعلان کے باوجود ایشیا میں خلافتِ عثمانیہ کے بیشتر علاقوں ــ عراق، شام، لبنان، بیت المقدس، فلسطین ــ سب پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ بلکہ عین جزیرۃ العرب بھی انگریزی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا؛ اور شریفِ مکّہ سے خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کرادی گئی۔ قصّہ کوتاہ ۱۹۱۷ء کے آخر تک جنگ کا نقشا اس حد تک بدل چکا تھا کہ اصحابِ خرد و دانش کو یقین ہوگیا کہ جرمنی جنگ ہار گیا ہے: اب وہ اسے جب تک چاہے، طول دے لے، بہرحال اس کی فتح ممکن نہیں، اور بالآخر اسے ہتیار ڈالنا پڑینگے۔

یہ تھی صورتِ حال ۱۹۱۸ء کے آغاز میں۔ اب انگریزوں کو اطمینان ہوگیا تھا کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ اور جرمنی اور اس کے حلیفوں کے خلاف اقدام کرنے پر کوئی ہمیں روکنے والا نہیں۔ اب ان کے دل میں ہندُستانی مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ بھی

Marfat.com

کم ہی رہ گیا تھا۔ چنانچہ برطانوی وزیراعظم (مسٹر لائیڈ جارج) نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا :

> ہم جنگ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ ترکیا کو اس کے پایۂ تخت سے محروم کردیں، یا ایشیاے کوچک اور تھریس کے زرخیز اور اہم علاقے اس سے چھین لیں، جن میں ترکی نسل کی آبادی کی اکثریت ہے۔
>
> ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی ہے، وہاں بدستور ترکی کی حکومت قائم رہے اور قسطنطنیہ ہی اس کا پایۂ تخت رہے۔ البتہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کو ملانے والے بحری رستے کو بین الاقوامی انتظام اور نگرانی میں رہنا چاہیے۔ ہماری رائے میں عرب، آرمینیا، عراق، شام اور فلسطین بھی اپنی اپنی الگ آزاد قومی حکومتوں کے مستحق ہیں۔

جن لفظوں میں یہ تقریر کی گئی، اور ان میں جو عزائم مضمر تھے، پوری احتیاط کے باوجود وہ کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گویا سلطنتِ عثمانی کے حصّے بخرے کرنے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اور خلافتِ عثمانی کا تصوّر قومی حکومتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

اس کے تین دن بعد (۸ جنوری ۱۹۱۸ء) امریکا کے صدر ووڈرو ولسن نے اپنے شہرۂ آفاق چودہ نکات کا اعلان کیا، جو بالآخر اختتامِ جنگ کے بعد صلحنامے کی بنیاد ثابت ہوئے۔ ان میں کا بارھواں نکتہ یہ تھا :

> ترکی کو یقین دلایا جائے کہ موجودہ سلطنتِ عثمانی میں جو ترکی حصّہ ہے، وہ بدستور اس کے قبضے میں رہیگا۔ لیکن جو دوسری اقوام سلطنتِ ترکی کے زیرِ اقتدار ہیں، انھیں بھی اس امر کا اطمینان دلادیا جائے کہ ان کی جان و مال بھی محفوظ رہیگی، اور ان کی ترقی میں کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔

ان اعلانات سے ہندستان کے مسلمانوں میں بےچینی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ جرمنی کی توکسے

Marfat.com

فکر تھی. لیکن ترکیا اور سلطنتِ عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کے ساتھ مسلمانوں کے صدیوں کے گہرے دینی اور جذباتی تعلقات تھے. اگرچہ حکومتِ ہند کا ۴ نومبر ۱۹۱۴ء کا اعلان اور وعدہ موجود تھا، جس میں، فتح کی صورت میں، ترکیا اور خلیفۃ المسلمین کے مفاد کی حفاظت کی یقین دہانی کرائی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود لوگوں کو پورا اطمینان نہیں تھا، گو آج تک کسی نے کھل کر بات نہیں کی تھی. اب وزیرِ اعظم انگلستان اور صدرِ امریکا نے جو یہ بیان جاری کیے، تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کے اندیشے حقیقت کی شکل اختیار کرنے والے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوگئی، اور جرمنی کی شکست پر مہر لگ گئی۔ اب فریقین کے درمیان صلحنامے کی باتیں فضا میں تھیں. ان دنوں طرح طرح کی افواہیں اور چہ میگوئیاں گشت لگا رہی تھیں۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ مملکتِ عثمانی کے تمام علاقے اس سے الگ کر دیے جائیں گے. ایسے میں مسلمانوں کی گھبراہٹ اور تشویش قدرتی بات تھی۔ اس بگڑتی حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے، ۱۹۱۹ء کے شروع میں، بمبئی کے بعض سرگرم اور دردمند اصحاب نے "بمبئی خلافت کمیٹی" قائم کی۔ اس کے صدر بمبئی کے مشہور تاجر سیٹھ میاں جان محمد چھوٹانی اور سکتر حاجی احمد صدیق کھتری تھے۔ افسوس کہ اس کمیٹی کی تشکیل اور لائحۂ عمل کی تفصیلات کا کوئی علم نہیں ہوسکا. لیکن علما کے طبقے میں بھی سب محسوس کر رہے تھے کہ، اگر جلد کوئی موثر اقدام نہ کیا گیا تو خلافتِ عثمانیہ کا نام نشان تک ہمیشہ کے لیے ناپید ہوجائیگا، اور یوں اسلامی دنیا اپنے ایک بنیادی دینی ادارے سے محروم ہوجائیگی. چنانچہ اس مسئلے پر غور و فکر کے لیے ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں علما کا ایک اجتماع ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ "مرکزی خلافت کمیٹی" قائم کی جائے۔ اس کے لیے "بمبئی خلافت کمیٹی" کے عہدے دار برقرار رکھے گئے، اور عارضی طور پر اس کا دفتر بھی بمبئی ہی میں رکھنے پر اتفاق ہوگیا۔

اس نئی تنظیم کا پہلا کل ہند اجلاس بہ صدارت فضل حق (کلکتہ) ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دلی میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی (جو ۱۹۱۵ء میں ہندستان واپس آچکے تھے) اس جلسے میں موجود تھے۔ کانفرنس میں مختلف تجویزیں پیش ہوئیں کہ اگر انگریز اور اتحادی اپنی مخالفِ ترکیا پالیسی

Marfat.com

پر مُصر رہیں، تو کیا قدم اُٹھایا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد دو فیصلے ہوئے:
اوّل: مسلمان بطورِ احتجاج ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کے مجوّزہ جشنِ آزادی میں کوئی حصّہ نہ لیں۔
دوم: ایک وفد انگلستان جائے اور حکومتِ برطانیہ پر ترکیا اور خلافتِ عثمانی کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات اور خیالات واضح کرے۔
نیز یہ فیصلہ ہوا کہ اگلی کانفرنس اواخر دسمبر (۱۹۱۹ء) میں امرتسر میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے دنوں میں منعقد کی جائے۔
مجوّزہ وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے دوسرے ارکان مولانا سیّد سلیمان ندوی، سید حسین (بمبئی کرانیکل) تھے۔ علی گڑھ کے مشہور پرانے طالب علم حسن محمد حیات (لارڈ حیات) سکتّر چنے گئے تھے۔ وفد اکتوبر ۱۹۱۹ء میں بے نیلِ مرام وطن واپس آیا۔
اس دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رانچی کی نظر بندی سے رہا کر دیے گئے۔ وہ دلّی پہنچے۔ یہاں اس وقت مجلسِ خلافت کے عمائد وائسرائے کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے بھی محضر پر دستخط کرنے اور وفد میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ مولانا آزاد نے دستخط تو کر دیے لیکن وائسرائے کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب مسئلۂ خلافت میں درخواستیں گزارنے یا محضر پیش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا؛ بلکہ اس کے لیے زیادہ کڑے اقدامات کا وقت آگیا ہے۔ یہ وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے کی خدمت میں گیا، اور حسبِ توقع خالی ہاتھ واپس آیا۔ اس موقع کی دو اور اہم باتیں قابلِ ذکر ہیں۔
پہلی یہ کہ مولانا آزاد کی گاندھی جی سے اوّلین ملاقات اسی موقع پر یہیں دلّی میں حکیم محمد اجمل خان کے مکان پر ہوئی۔
اس ملاقات کے دوران میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ اس محفل میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا عبدالباری (فرنگی محل، لکھنؤ) مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری بھی موجود تھے۔ تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا کہ گاندھی جی نے عدم تعاون (نان کوآپریشن)

Marfat.com

کی تجویز پیش کی۔ تمام اکابر نے کہا کہ ہمیں اس پر غور کرنے کا موقع دیا جائے، ہم اس کا جواب بعد کو دینگے۔ لیکن مولانا آزاد نے فوراً اسے قبول کرلیا۔ اور کہا کہ مجھے یہ منظور ہے اور یہی صحیح راہِ عمل ہے (بعد کو انھوں نے اسے نصِ قرآنی سے ثابت کیا جو ان کے قرآن پر غور و فکر کی دلیل ہے)

اس کے بعد مجلسِ خلافت کی تیسری کانفرنس وسطِ فروری ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں ہوئی۔ اس میں پھر عدم تعاون کی تجویز پیش ہوئی۔ لیکن اس پر فیصلہ وفدِ خلافت کے انگلستان سے واپس آنے تک ملتوی کر دیا گیا۔

خلافت کے عمائد ابھی تذبذب میں تھے کہ انھیں دنوں انگلستان کے لاٹ پادری نے اپنی ایک تقریر میں کہہ دیا کہ مسلمانوں سے سات سو برس قبل کی حروبِ صلیبیہ کی شکست کا حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ قدرتاً اس پر جذبات سخت مشتعل ہوگئے۔ خاص طور پر اس لیے کہ وزیرِ اعظمِ انگلستان اپنے اعلان (۲ نومبر ۱۹۱۴ء) میں یقین دہانی کرا چکے تھے کہ یہ جنگ مذہبی نہیں ہے۔ یہی انتشار کی حالت تھی کہ اس کے فوراً بعد ۲۸۔ ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسے کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنا خطبۂ صدارت لکھا نہیں تھا۔ بلکہ حاضرین کو برجستہ فی البدیہہ خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر اسی وقت ساتھ ساتھ قلمبند کرلی گئی تھی۔ اور ان کی نظرِ ثانی کے بعد اسی زمانے میں کلکتہ خلافت کمیٹی کی طرف سے "مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

اس مسئلے پر یہ خطبہ سند ہے۔ اس میں خلافت کی دینی، تاریخی، سیاسی حیثیت پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور ہر ایک دعوے پر قرآن و حدیث، ائمۂ فقہ اور تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد پوری تحریک خلافت کے لیے اس خطبے نے بنیادی آئین کا کام دیا۔ اس میں خاص طور پر یہ مسئلے کھل کر سامنے آگئے۔

اوّل: خلافت محض سلطان ترکیا کے خلیفۃ المسلمین ہونے کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اسے تسلیم کرنا اور کسی خلیفہ کا ہر زمانے میں موجود رہنا اسلام

Marfat.com

کے عقائد میں داخل ہے۔

دوم : انھوں نے پھر سورۂ ممتحنہ کی محولۂ فوق آیات (۸-۹) سے استدلال کیا کہ قرآن نے غیر مسلم دنیا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک فریق وہ ہے جو مسلمانوں کو قتل کرتا ہے، انھیں اُن کے گھر بار اور وطن سے باہر نکالتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا، بلکہ ان کی طرف دوستی اور محبّت کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے؛ اور دوسرا ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کا ہے۔ پہلا فریق محارب ہے اور دوسرا دوست۔ پہلے سے کبھی دوستی اور تعاون جائز نہیں۔ اور دوسرے کے ساتھ ہر معاملے میں دوستی اور تعاون فرض ہے؛ بلکہ حضرت شارع علیہ الصّلواۃ والسّلام کی سُنّت کی پیروی میں ہم برادرانِ وطن کے ساتھ ایک قوم بننے پر مجبور ہیں۔

سوم : انھوں نے غزوۂ تبوک کے زمانے میں کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے عمل سے یہ استدلال کیا کہ ترکِ موالات (نان کوآپریشن) اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اور ہمیں انگریزوں اور حکومتِ ہند کے خلاف اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اس واقعے کی مکمّل صورت اور مولانا آزاد کے استدلال اور اس سے اخذ کردہ نتائج کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔[19]

(۵)

۹ ھ کا واقعہ ہے کہ خبر ملی کہ رومیوں نے تبوک میں چالیس ہزار کا لشکر جمع کر لیا ہے اور وہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ بڑی تنگدستی اور بے سروسامانی کا زمانہ تھا۔ ہر طرف قحط کے سے آثار تھے۔ اس پر شدید گرمی کا موسم تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تمام مسلمانوں کو ہتیار بندی اور کُوچ کا حکم دے دیا کہ پیشقدمی

۱۹۔ بخاری (کتاب المغازی۔ غزوہ تبوک) میں پوری حدیث خود کعب بن مالک سے مروی موجود ہے۔ وہیں، کتاب الاحکام کے آخری باب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

کر کے تبوک پہنچ جائیں۔ دفاع اور قوم کے لیے حیات اور موت کا سوال تھا۔ لہٰذا حکم عام تھا اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔

منافقین کے علاوہ صرف تین انصاری اصحاب، کعب بن مالک اور ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن ربیع فوج کے ساتھ نہ جا سکے۔ یہ تینوں اصحاب بدری تھے۔ بلکہ کعب بن مالک کا تو سابقون الاوّلون میں شمار ہے، وہ عقبہ کی بیعتِ ثانیہ کے ۷۳ اصحاب میں شامل تھے۔ کعب کہتے ہیں کہ میں کسی بدنیّتی کے باعث نہیں، بلکہ سہل انگاری اور کاہلی کے سبب نہ جا سکا۔ میں نے پورا سامان مہیا کر لیا تھا۔ لیکن آج کل کرتا رہا، تا آں کہ وقت نکل گیا۔ فوج بہت دور نکل گئی، اور میں ان سے مل نہ سکا۔

اسلامی فوج کے اس مستعدی اور قوّت کے ساتھ نکلنے کی خبر سنتے ہی رومیوں کی ہمّت جواب دے گئی، اور وہ منتشر ہو گئے۔ لہٰذا جب آنحضرت صلعم تبوک پہنچے، تو میدان صاف تھا۔ آپ نے وہاں تین چار ہفتے قیام کیا اور اس کے بعد مدینہ واپس چلے آئے۔

مدینہ پہنچے، تو تینوں اصحاب جو ساتھ نہیں جا سکے تھے، حاضر خدمت ہوئے۔ عذر پیش کیا اور معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ جرم ایسا نہیں کہ یوں آسانی سے معاف کر دیا جائے۔ جاؤ، گھر میں بیٹھو اور فیصلۂ وحی کا انتظار کرو۔ تمام مسلمانوں کو حکم ہوا کہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔ کوئی اُن سے ملے، نہ بات چیت کرے، نہ واسطہ رکھے۔ یہاں تک کہ اُن کی بیویوں کو بھی اُن سے تعلقات منقطع کر لینے کی ہدایت کر دی گئی۔

یہ مقاطعہ ۵۰ دن تک جاری رہا۔ ان غریبوں نے یہ زمانہ جس طرح سے آہ و زاری اور انابت الی اللہ میں کاٹا، اس کا حال بخاری کی مولۂ فوق تفصیلی حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بالآخر آیت نازل ہوئی:[۲۰]

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا	اور (اسی طرح) ان تین شخصوں پر بھی (اس کی رحمت
حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ	لوٹ آئی) جو (معلق حالت میں) چھوڑ دیے گئے تھے

۲۰۔ سورۃ التوبہ، ۹ : ۱۱۸

Marfat.com

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(اور اس وقت لوٹ آئی) جب کہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لیے تنگ ہوگئی تھی۔ اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے۔ اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی، مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس، اللہ (اپنی رحمت سے) ان پر لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا ہی رحمت والا۔

اس کے بعد ان تینوں کو معافی مل گئی اور حالات معمول پر آ گئے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے:

حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ایک حدیث مروی ہے (اور دوسرے صحابہ سے بھی) کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مومن (مسلم) کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ خفا ہو کر کسی مسلمان کو چھوڑ دے (متفق علیہ)۔ اور یہاں ان تینوں حضرات سے پوری قوم ۵۰ دن تک خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بے تعلق اور خفا رہی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا قوم کے دفاع میں حصہ نہ لینا، اور اس طرح بالواسطہ دشمن کی اعانت کرنا، کتنا بڑا جرم خیال کیا گیا۔ مولانا آزاد اس واقعے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب ان جلیل القدر صحابہ کو ملک کے دفاع میں، کسی بدنیتی سے نہیں بلکہ غفلت اور تساہل کے باعث، حصہ نہ لینے پر اتنی سخت سزا ملی، تو ہمارا ان لوگوں سے کیا سلوک ہونا چاہیے، جو عمداً خلافت کے سلسلے میں، انگریزوں سے تعاون کر رہے ہیں، جو ہمارے دین و دنیا کے دشمن ہیں!

اس کے بعد وہ دو فیصلے سناتے ہیں[۲۱]:

(۱) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہے۔

.... پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں کا دینی فرض ہے۔ جو ان کی

۲۱۔ مسئلہ خلافت: ۲۸۴

Marfat.com

اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا
... جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی، یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا
اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔

(۲) صرف خلیفۂ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو، تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ وہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے، یا ان کی مدد کرے۔ اگر کریگا تو بحکم مَن حَمَلَ عَلَينَا السِّلَاحَ فَلَيسَ مِنَّا [۲۲] اور نصِ قرآنی مَن يَقتُل مُؤمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا [۲۳] وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائیگا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اس کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس میرٹھ میں ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس کلکتے کے خطبے کے بعد یہ پہلی آل انڈیا خلافت کانفرنس تھی۔ مہاتما گاندھی نے جو اس جلسے میں بھی موجود تھے، پہلی مرتبہ باقاعدہ، رسمی طور پر، اپنی عدم تعاون کی تجویز پیش کی جو منظور ہوگئی۔ اس کی رُو سے ملک سے مطالبہ کیا گیا کہ

(۱) تمام سرکاری خطابات اور اعزازات حکومت کو واپس کر دیے جائیں۔
(۲) سپاہی فوج اور پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔
(۳) سرکاری ٹیکس اور دوسری واجب الادا رقوم کی ادائی سے انکار کر دیا جائے۔

اسی کے ساتھ اسکیم کی کامیابی کے لیے انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر خاص زور دیا۔
ہنوز ترکیا سے مجوزہ صلحنامے پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ نفنا میں خلافت عثمانی کے بارے میں بڑی دہشتناک خبریں گشت لگا رہی تھیں۔ ایک حلقے کو توقع تھی کہ شاید حکومتِ برطانیہ اپنا

۲۲۔ متفق علیہ۔ بخاری۔ کتاب الفتن (۷ : ۲ : ۱۰۴۷)۔ (اصح المطابع، دلی) یہ حدیث متعدد دوسرے مجموعوں میں بھی موجود ہے۔

۲۳۔ النساء، ۴ : ۹۳

Marfat.com

اثر و رسوخ استعمال کر کے صلح کی شرائط میں کچھ نرمی کرا سکے۔ چنانچہ اس کے بعد (۱-۲-۳ جون ۱۹۲۰ء کو) خلافت کا جو اجلاس الہ آباد میں ہوا، اس میں باتفاق رائے یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک وفد وائسرائے سے مل کر انھیں خلافت کے مسئلے میں مداخلت پر آمادہ کرے اور انھیں یہ بتا دیا جائے کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء تک حکومتِ برطانیہ شرائطِ صلح میں مناسب تبدیلی کرانے میں کامیاب نہ ہوئی، تو اس کے بعد ہندستان کے مسلمان ترکِ موالات پر مجبور ہو جائینگے۔

یکم اگست آیا، اور گزر گیا۔ نہ وائسرائے کچھ کر سکے، نہ حکومتِ برطانیہ نے معاہدۂ سیورے میں کسی نرمی کے لیے کوئی سلسلہ جنبانی کی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۲۰ء کو صلحنامہ مکمل ہو گیا اور اس پر ترکیا کی طرف سے توفیق پاشا نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔

اس کے بعد ترکِ موالات کی تحریک کے دوران میں جو کچھ ہوا؛ ملک نے اس میں جو عدیم المثال قربانیاں دیں؛ اور حکومت نے اس تحریک کے دبانے کے لیے جس سختی اور تشدد سے کام لیا، یہ سب کچھ تاریخِ ہند کا حصہ ہے، اور ہمارے موضوع سے خارج۔ لیکن یہاں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ "ترکِ موالات" کی اصطلاح مولانا آزاد کی وضع کی ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ ترکِ موالات کی تحریک دراصل خلافت کی تحریک تھی۔ شروع میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا؛ کانگریس نے اسے بعد کو اپنایا۔

(۶)

۶ تا ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس کا اسپیشل اجلاس کلکتے میں ہوا۔ اس کے ایجنڈا میں خاص طور پر کانگریس اور تحریکِ خلافت کے باہمی تعلقات اور ترکِ موالات پر غور کرنا شامل تھا۔ خلافت کا اجلاس بھی اسی زمانے میں وہاں مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا تھا۔ ترکِ موالات کے مسئلے پر طویل اور گرما گرم بحث ہوئی۔ دراصل بعض لیڈر اس کے خلاف تھے۔ بہرحال کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک (۱۸۸۶ء حق میں ۸۸۴ خلاف) اور خلافت سے مکمل تعاون کی تجویز منظور کر لی۔ اور مہاتما گاندھی کانگریس

Marfat.com

رہنما تسلیم کر لیے گئے۔[۲۴]

اس کے بعد حسبِ معمول کانگریس کا سالانہ اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۲۰ء سے شری وجے راگھو چاریار کی صدارت میں ناگپور میں ہوا۔ اس میں ترکِ موالات کی کلکتہ والی قرارداد کی تصدیق کر دی گئی۔ کانگریس نے خلافت کانفرنس، میرٹھ میں منظور کردہ سہ گانہ تحریک میں کئی اور مدات کا اضافہ کر کے اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع کر دیا۔ اب اس کی یہ شکل ہو گئی[۲۵]

(۱) حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ نے خلافت کے معاملے میں اپنے وعدوں کا کوئی پاس نہیں کیا، اور خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔

(۲) پنجاب کے مظالم کے سلسلے میں بھی مجرموں سے کوئی باز پُرس نہ کر کے حکومت نے ظالمانہ اور غیر منصفانہ رویّے کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا واحد علاج سوراج ہے جس کے حصول کے لیے ہم مصمّم عہد کرتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے ہم فی الحال مہاتما گاندھی کے مجوّزہ مندرجہ ذیل بتدریج عدم متشدّدانہ ترکِ موالات پروگرام کی تائید کرتے ہیں:

(۱ الف) تمام سرکاری خطابات اور اعزازات واپس کر دیے جائیں اور تمام مقامی اداروں کے نامزد اراکین استعفیٰ دے دیں۔

(ب) تمام درباروں اور تقریبوں اور حکومت کی طرف سے منعقدہ سرکاری اور نیم سرکاری جلسوں میں حاضری سے انکار کر دیا جائے۔

(ج) سرکاری، سرکار سے امداد پانے والے، یا سرکار کے انتظام میں چلنے والے تمام اسکولوں اور کالجوں سے، طلبہ بتدریج نکل آئیں (اور ان کی جگہ تمام صوبوں میں آزاد قومی درس گاہیں قائم کی جائیں)

۲۴۔ انڈین نیشنل کانگریس (انگریزی از پتابھی سیتا رامیا)، ۱: ۲۰۲ - ۲۰۳ (نئی دلّی: ۱۹۰۵ء)

۲۵۔ ایضاً، ۱: ۲۰۳

Marfat.com

(د) تمام وکلا، اور مقدمے دائر کرنے والے حضرات بتدریج حکومت کی قائم کردہ عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔

(ہ) فوج کے سپاہی اور انتظامی عملہ اور کارکن عراق میں ملازمت کے لیے جانے پر ہرگز تیار نہ ہوں۔

(و) کونسلوں کے انتخاب کے تمام امیدوار اپنی درخواستیں واپس لے لیں۔ اور اگر کانگریس کی اس ہدایت کے باوجود کوئی امیدوار کھڑا ہوجائے تو اسے ووٹ نہ دیا جائے۔

(ز) تمام بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ (اس کے لیے چرخہ کاتنے اور کھادی کے استعمال کی خاص سفارش کی گئی)

(۷)

آل انڈیا مجلسِ خلافت کی سالانہ کانفرنس ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی میں منعقد ہوئی۔ مولانا محمد علی اجلاس کے صدر تھے۔ یہ تحریکِ خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں اور اتحادی طاقتوں نے ترکیا کے ساتھ صلحنامے کی جن شرائط کا اعلان کیا تھا، اُن سے ترکیا کی آزاد حیثیت بالکل ختم ہوجاتی تھی؛ اور عثمانی خلافت کا صدیوں کا بنا ہوا پورا شیرازہ بکھر جاتا تھا۔ اس سے لوگوں کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ لازماً کانفرنس میں سخت جوش وخروش تھا، اور لوگ کچھ مثبت تجاویز سننے اور عملی اقدام کی توقع لے کر جمع ہوئے تھے۔

اس کانفرنس کی سب سے اہم قرارداد یہ تھی کہ انگریزی فوج کی نوکری حرام ہے؛ مسلمانوں کو اس سے مستعفی ہوجانا چاہیے۔ اس پر دلیل یہ دی گئی کہ جنگ میں مسلمان فوجیوں کو مسلمانوں سے لڑنا پڑتا ہے، اور یوں مسلمان، مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوتا ہے جو قرآن کے صریح حکم کے خلاف ہے، جس کی سزا جہنم بیان کی گئی ہے[۲۶]۔ پس یہ کسی طرح جائز نہیں کہ مسلمان فوج میں بھرتی ہوں۔

۲۶- النساء، ۴ : ۹۳

Marfat.com

یہ تجویز صاحبِ صدر، مولانا محمد علی نے خود پیش کی۔ اور اس کی تائید کے بعد دیگرے مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد، جگت گورو وینکٹ رامن شنکر اچاریہ (شاردا پیٹھ) نے پُرزور اور جوشیلی تقریروں میں کی، اور قرارداد باتفاق رائے منظور ہوگئی۔

جلسہ ختم ہوگیا اور سب لوگ اپنے اپنے مقام پر چلے گئے۔ لیکن حکومت غافل نہیں تھی۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی کو والٹیر کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا۔ اور پھر ایک کے بعد ایک وہ تمام حضرات جنھوں نے تجویز کی تائید میں تقریریں کی تھیں پکڑ لیے گئے۔ ان کے علاوہ دلّی میں مولانا احمد سعید اور عبدالعزیز وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس قرارداد کی غرض ملک معظم کی فوج میں بغاوت پھیلانا اور تشدّد کی ترغیب دینا ہے۔ مقدّمہ چلا۔ عدالت نے شنکر آچاریہ کے سوائے سب حضرات کو دو دو برس قید کی سزا دے دی۔

اس کے کوئی مہینا بھر بعد یوپی پراونشل مجلسِ خلافت کا سالانہ اجلاس (۲۵۔۲۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء) آگرہ میں ہوا۔ مولانا آزاد صدر تھے۔ انھوں نے اجلاس کے دوسرے دن (۲۶ اکتوبر) اس مقدّمے پر تفصیلی تقریر کی اور بتایا کہ فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی قراردادیں تو ڈیڑھ دو برس سے ملک بھر کے تمام جلسوں میں منظور ہوتی آرہی ہیں۔ خود میں نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ فیصلہ میرا نہیں، بلکہ قرآن کا حکم ہے۔ انھوں نے پھر سورۂ ممتحنہ کی محولۂ فوق آیات (۸۔۹) کا حوالہ دیا، ان کی تفسیر کی اور بتایا کہ انگریزی حکومت، اس نصِ قرآنی کی رو سے، اُس گروہ میں شامل ہے، جس سے تعاون اور موالات اور دوستی جائز نہیں: "کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔"[۲۷]

انھوں نے اسلام کی تعلیم ان لفظوں میں بیان کی:[۲۸]

> اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو، اس کام کو، جس میں انسان کا خون بہانا پڑے، ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے، جس کے لیے رسول کی زبان

۲۷۔ خطباتِ آزاد، ۱: ۷۳

۲۸۔ ایضاً، ۱: ۷۹

Marfat.com

پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں، بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اُس کا خون بہانا ایک بہت بڑی معصیت، گناہ، پاپ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا ہے: وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ[29] یعنی وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے، کسی جان کو قتل نہیں کرتے، جسے اللہ نے روک دیا ہے، اور جسے اللہ نے حرام کر دیا۔ لیکن اگر انھیں کرنا پڑتا ہے، تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں، جن جانوں کو، اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔

انھوں نے اس تقریر میں یاد دلایا کہ میں نے ۱۹۱۶ء میں جب میں رانچی میں نظر بند تھا، حکومت کو ایک چھٹی لکھی تھی، جس میں "نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیے تھے، جن کی رُو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے"[30] ا پھر تحدّی کرتے ہوئے کہتے ہیں[31]:

> ہاں، ہاں، میں نے سپاہیوں سے، ہندستان کی برٹش فوج سے، یہ کہا ہے، اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں، اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو، میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں، اور اُن سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشّان برٹش گورنمنٹ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ (مجھے) گرفتار کرے! اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے، اور لوگوں

۲۹- سورۂ فرقان، ۲۵: ۶۹

۳۰- خطباتِ آزاد، ۱: ۷۲

۳۱- ایضاً، ۱: ۷۴

Marfat.com

سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے، تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی! کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے! حکومت نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا تھا۔

(۸)

جب مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا ہے، تو علی گڑھ اسکول کے زیرِ اثر مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے نزدیک سیاستِ ملکی میں دلچسپی یا داخلہ، شجرِ ممنوعہ سے کم نہیں تھا۔ چونکہ سرسید کی تعلیمی پالیسی کسی حد تک کامیاب رہی تھی، اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ انھوں نے سیاست سے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ بھی درست ہوگا۔ انگریزی حکومت نے بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو فراخدلی سے سرکاری نوکریوں میں لے کر اُن کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس لیے بھی یہ خیال پختہ ہو گیا کہ سرسید کی دکھائی راہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور کسی کو اس ہمرنگِ زمیں جال کی تہ تک دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے آج تک اس کے خلاف چلنے یا اس پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

جادو کے اس حصار کو پہلی مرتبہ مولانا آزاد اور الہلال نے توڑا، اور اس کے خلاف آواز بھی اُٹھائی تو قرآن اور حدیث کی بِنا پر۔ مسلمان اس آواز کے سننے پر مجبور تھے کیونکہ سرسید کے مقابلے میں یہ خدا اور رسول کی آواز تھی۔ اسی لیے اس کی کامیابی بھی یقینی تھی۔

یہی پہلی عالمی جنگ کا بھی زمانہ ہے۔ اس کی مناسبت سے مولانا آزاد نے جہاد کا صور پھونکا۔ یہ سرسید کی تعلیم پر دوسری کاری ضرب تھی۔ وہی مسلمان جو سرسید کی تحریروں سے متاثر ہو کر اس حکمِ خداوندی کو فراموش کر چکے تھے، یکایک خوابِ غفلت سے چونک اُٹھے، اور انھیں محسوس ہوا کہ ہم آج تک ایک ضروری فرض کی ادائی میں قصوروار رہے ہیں۔

اب نہ صرف مسلمانوں نے ملکی سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا، بلکہ ترکیا کے خلاف انگریزی

Marfat.com

سیاست اور جوڑ توڑ نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ملک میں تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہوا' تو ہندوؤں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ مولانا آزاد نے قرآن اور سنّتِ رسول سے ثابت کیا کہ چونکہ انگریز ہر میدان میں مسلمانوں کے حقوق پامال کر رہے ہیں، مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں' انھیں ان کے گھر بار اور وطن سے نکال رہے ہیں' لہٰذا وہ فریقِ محارب ہیں' ان سے کسی صورت تعاون جائز نہیں' یہ حکمِ قرآنی کے خلاف ہے۔ اُن کے مقابلے میں ہندو برادرانِ وطن اپنے قول و فعل سے ہمارے ساتھ دوستی اور تعاون کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ پس ہمیں انگریزوں سے ترکِ موالات کرنا' اور ہندوؤں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔

آپ دیکھینگے کہ ان سب مسائل میں مولانا آزاد کا استدلال قرآن اور حدیث سے تھا۔ وہ قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں[۳۲]:

> کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں' اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے' میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصّہ میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اور علومِ قرآن کے مباحث و مقامات کا کوئی گوشہ نہیں' جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے' وہ مجھے ورثے میں ملا؛ اور جو کچھ جدید ہے' اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی

۳۲- ترجمان القرآن' ۱:۵۱-۵۲ (ساہتیہ اکادیمی ایڈیشن)

Marfat.com

بھالی ہیں، جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔

رہا ہوں رند بھی میں، اور پارسا بھی میں
مری نظر میں ہیں رنداں و پارسا اک ایک

خاندان، تعلیم اور سوسائیٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل روز ہی اُس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہوسکیں، اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

اسی طویل مطالعے اور غور و فکر اور تدبّر کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے جو فیصلہ کیا، وہ اتنا صحیح اور پایدار تھا کہ انھیں کبھی اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اور یہ ہے بھی سچ بات۔ خدائی فیصلے اٹل ہوتے ہیں، انھیں تبدیل کرنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوسکتی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۳:۶۲)۔ اور جو نتیجے آپ خدائی احکام اور فیصلوں پر مبنی کرینگے، وہ بھی اٹل اور غیر متبدل ہونگے۔

یہی وجہ ہے کہ عمر بھر مولانا آزاد کا فیصلہ اور عمل ایک ہی رہا۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں جس راہ پر قدم رکھا تھا، ۱۹۵۸ء میں اپنی وفات تک، اُس سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس مسافرت میں انھیں اپنوں سے، اور غیروں سے، کیا کچھ نہیں سُننا پڑا، کیا کچھ نہیں سہنا پڑا! لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے لیے یہ راہ قرآن پر تدبّر و تفکّر کے بعد انتخاب کی تھی؛ سنّتِ رسول کے مطالعے کے بعد اختیار کی تھی۔ جب تک یہ دونوں ماخذ تبدیل نہ ہو جائیں، اور اس کے نتیجے میں ان سے اخذ کردہ نتائج غلط نہ ثابت ہوجائیں، وہ کیونکر اپنی مقرر کردہ راہ ترک کر سکتے تھے!

جاننے والے جانتے ہیں کہ پوری تحریکِ خلافت کا آئین و دستور ان کا خطبۂ کلکتہ تھا، جو اسی زمانے میں کتابی شکل میں شائع ہوگیا تھا۔ اور یہی تحریک ہندو مسلم اتحاد کی ابتدا اور مسلمانوں کے ملکی سیاست میں جوق در جوق شامل ہونے کا باعث ثابت ہوئی۔

Marfat.com

مسلمانوں کو ملکی سیاست میں شامل کرنے کے لیے لابُد تھا کہ انھیں ترغیب دلانے کے لیے مذہبی بنیاد قائم کی جائے۔ یہ بنیاد مولانا آزاد نے اپنے عمر بھر کے قرآنی اور اسلامی مطالعے اور غور و فکر کے نتائج کی شکل میں پیش کی۔ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن یہ ہے واقع کہ مولانا آزاد اس پوری تحریک کے فلاسفر اور اصول ساز تھے۔ اور بیشتر دوسرے مسلم رہنما اس کے دست و بازو اور نافذ کرنے والے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

غالبؔ اور ابوالکلام آزاد

غالبؔ اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کی زندگی میں کئی لحاظ سے بہت مماثلت ہے۔ اور باوجودے کہ ان کی سرگرمیوں کے میدان ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، ان کے کردار کا یہ اشتراک صرف دلچسپ ہی نہیں، بلکہ ان دو نابغہ روزگار (GENIUS) شخصیتوں کے نفسیاتی مطالعے کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔

مثلاً پہلی بات یہی لیجیے کہ دونوں پیدائشی باغی تھے۔ دونوں نے آبائی عقائد سے بغاوت کی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے غالبؔ کے ددھیال اور ننھیال ـــــ دونوں خاندانوں کے عقائد اہلِ سنّت کے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ غالبؔ نے بھی ایک مرتبہ تمسخر میں کہا تھا: شیعی کیونکر ہو ما وراء النہری، واقعی اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ وسط ایشیا کے جس خطّے سے ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خان، اٹھارویں صدی کے وسط میں ہجرت کرکے ہندستان آئے تھے، وہ سُنّی عقائد کا گویا گڑھ تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہاں کے باشندے اپنے معتقدات میں بہت کٹّر تھے۔ ان کی یہ خصوصیت ضرب المثل کا درجہ حاصل کرچکی تھی اور اسی کی طرف غالبؔ نے اپنے اس مصرعے میں اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ غالبؔ کے دادا میرزا قوقان بیگ خان اور خاندان کے دوسرے افراد بھی اسی عقیدے کے پیرو تھے۔

ایک اور بات۔ قرائن سے استنباط کیا جاسکتا ہے کہ لوہارو کے اور غالبؔ کے خاندانوں میں اگر پہلے سے رشتہ داری نہیں تو بہت قریبی تعلقات ضرور تھے۔ ورنہ اس زمانے میں جب کہ

Marfat.com

کفو اور غیر کفو کا سوال اتنا اہم تھا، نواب احمد بخش خان (والیِ لوہارو) کی ہمشیر کا عقدِ نکاح غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان سے ممکن نہیں تھا۔ بعد کو خود غالبؔ کا نکاح نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہونا بھی اسی امر کی مزید دلیل اور ثبوت ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں پہلے سے گہرا ربط ضبط تھا۔ خاندانِ لوہارو کا اہل تسنّن ہی سے نہیں، بلکہ مشہور صوفی بزرگ خواجہ احمد یسویؒ کی اولاد میں ہونا سب کے علم میں ہے۔ پس یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ غالبؔ کے اجداد اہلِ سنّت کے عقیدے کے پیرو اور پابند تھے۔

غالب کے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے خاندان کا سُنّی ہونا بیان کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں[1]:

> میرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنّت وجماعت تھا۔
> تمام اقربا اور حقیقی دوست سنّت وجماعت تھے۔

مولانا حالیؔ ان کے سوانح نگار ہیں۔ غالبؔ کی سب سے پہلی سوانح عمری "یادگارِ غالب" حالیؔ ہی کی تصنیف ہے۔ وہ بھی اس کی تائید کرتے اور لکھتے ہیں[2]:

> جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ مرزا کے والد سنّی المذہب تھے۔

خود میرزا نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔

ان کی مالی پریشانیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناسخ نے غالبؔ کو مشورہ دیا کہ آپ حیدرآباد (دکن) چلے جائیں۔ وہاں ان دنوں مہاراجا چندو لال شاداں کا سا اہلِ کمال کا قدر داں اور صاحبِ دل شخص مدارالمہام ہے۔ اس کی ادنیٰ توجہ سے آپ کی تمام پریشانیاں رفع ہوجائینگی۔ غالب نے جواب میں لکھا[3] کہ تیس برس تو رنگ و بو کی سیر اور مے و نے کی صحبت میں

۱۔ آبِ حیات: ۵۱۳-۵۱۴ (مطبع کریمی، لاہور۔ بار دہم)

۲۔ یادگارِ غالب: ۲۱۵ (مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

۳۔ متفرقاتِ غالب: از سیّد مسعود حسن رضوی: ۱۰۱۔ (ہندستان پریس۔ رام پور۔ ۱۹۴۷ء)

Marfat.com

بسر ہو گئے۔ اب دل ان چیزوں سے بھر گیا ہے۔ اب تو یہ خواہش رہ گئی ہے کہ اگر موقع ملے تو، ایک مرتبہ ایران جاؤں اور شیراز کے آتشکدوں کو دیکھوں اور اگر پاؤں میں چلنے کی طاقت باقی رہے تو

فرجامِ کار بہ نجفِ اشرف برسم و مزارِ آں راکہ از کیشِ آبایم
بدر آوردہ و بخود بخود کشید، بنگرم؛ مستانہ جان دہم و سر بہ بالینِ فنا نہم۔

یہاں الفاظ "از کیشِ آبایم بدر آوردہ و بخود بخود کشید" بہت اہم اور غور طلب ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ اہلِ سنّت والجماعت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور بعد کو شیعیانِ علی میں شامل ہو گئے اور یہ تبدیلی معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائے عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ مثنوی "ابرِ گہربار" میں کہتے ہیں:

بُود گرچہ با ہر کسم سینہ صاف
من و ایزد، البتہ نبود گزاف
کہ تا کینہ از مہر بشناختم
بکس غیرِ حیدر نپرداختم
جوانی بریں در بسر کردہ ام
شبی در خیالش سحر کردہ ام
کنونم کہ وقتِ گزشتن رسید
زمانِ بحق باز گشتن رسید

....

چہ کاہد ز نیرویِ گرداں سپہر
چہ کم گردد از خوبِ ماہ و مہر

۴۔ کلیاتِ غالب (فارسی): ۱۵۴-۱۵۵

Marfat.com

کہ دل خستۂ دہلوی مسکنے
زخاکِ نجف باشدش مدفنے

یعنی میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور کینہ اور محبت میں امتیاز کرنا سیکھا۔ اسی دن سے حضرت علیؓ کے سوائے کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا۔ میری جوانی بھی اسی کے دروازے پر بسر ہوئی اور میری راتیں بھی اسی کی یاد میں گزریں۔ اب کہ وقت اخیر قریب آگیا ہے، کاشکے مدفن بھی نجف میں نصیب ہوجاتا۔

ایسا خیال گزرتا ہے کہ ان کے تبدیلیِ عقیدہ پر گھر میں کچھ لے دے ہوئی تھی اور بزرگوں نے ان سے باز پُرس کی تھی۔ اُن کا یہ شعر آپ بیتی کا رنگ لیے ہوئے ہے:

بامن میاویز، اے پدر! فرزندِ آزر رانگر
ہرکس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

اگر یہ خیال صحیح ہو، تو یہاں پدر سے ان کے نانا خواجہ غلام حسین خان کمیدان مراد ہوسکتے ہیں کیوں کہ اُن کے والد کا تو اُن کی کم سنی میں انتقال ہوگیا تھا؛ اس وقت یہ بمشکل دو برس کے ہونگے۔

ہمیں اس کی تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے "دینِ بزرگاں" ترک کرکے "یہ نیا دین" کیوں اختیار کیا! ہمارے لیے صرف یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ انھوں نے "دینِ بزرگاں" سے بغاوت کرکے اپنی راہ آپ نکالی تھی۔

ان کی یہ بغاوت کی خصوصیت محض مذہبی عقائد ہی تک محدود نہیں رہی۔ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو اس میں بھی روشِ عام کو چھوڑ کر نئے رستے پر چل نکلے۔ اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اس کے اعادے یا کسی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہ اردو شاعری خاص کر غزل میں، ولی اور محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ان کے اپنے زمانے تک کے جملہ شعرا جس ڈگر پر چلے جارہے تھے، غالبؔ نے اوّل روز ہی اسے یکسر چھوڑ دیا اور اپنے لیے نئی راہ ایجاد کی۔ اس جدّت یا بدعت کے لیے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اُنھیں اپنے وقت کے بڑے بڑے مُجتہدوں اور اُستادوں اور ان کی امّت سے کیا کچھ نہیں سُننا پڑا۔

Marfat.com

لیکن انھوں نے جو فیصلہ پہلے دن کر لیا تھا' اس پر جس پامردی اور استقلال اور صبر و شایش سے بے نیاز رہ کر وہ ڈٹے رہے' وہ بھی ہم سب کے علم میں ہے۔ زمانے نے کہ سب سے بڑا قاضی ہے' فیصلہ کر دیا کہ وہ راہِ راست پر تھے' اور ان کے مخالفین و معترضین غلطی پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس گھرانے میں پیدا ہوئے' وہ پشتوں سے دینی درس و تدریس اور رُشد و ہدایت کا مرکز چلا آرہا تھا۔ اُن کے والد مولانا خیرالدّین تو باقاعدہ پیری مریدی کے طریقے پر عمل پیرا تھے۔ بمبئی اور کلکتہ کے علاقے میں اُن کے مُریدوں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ معتقدات کے لحاظ سے وہ اتنے سخت قدامت پرست اور بے لچک تھے کہ پرانے مفسّرین اور علماء نے جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے' وہ اس سے سرِ مو انحراف بھی کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان کے زمانے میں جزیرۃ العرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اور ہندستان میں سرسیّد احمد خان نے نئی نئی باتیں کہنا اور اسلام کی نئی تفسیر اور تعبیر کرنا شروع کر دی۔ مولانا خیرالدّین کے نزدیک یہ دونوں کافر اور ان کی تائید کرنے والے اور ماننے والے اکفر سے کم نہیں تھے۔ آپ تعجّب کریں گے کہ ان کے خیال میں ملک بھر میں صحیح معنوں میں صرف ڈھائی مسلمان تھے۔ ایک وہ خود' دوسرے مولوی فضل رسول بدایونی اور آدھے مولانا احمد رضا خان۔

مولانا ابوالکلام آزاد انھیں مولانا خیرالدّین کے چھوٹے بیٹے تھے۔ انھوں نے تعلیم سراسر خود والد سے یا ان کے منتخب کردہ اساتذہ سے حاصل کی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس نہج پر رہی ہوگی' بالخصوص جب کہ ان سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ اپنے والد کے بعد ان کے مریدوں کی تربیت اور رہنمائی اور ہدایت کا کام جاری رکھیں گے۔ غرض کہ اُن کے ماحول اور تعلیم کا سارا نظم و نسق ایسا تھا کہ اس میں نئی روشنی کا تو کیا ذکر' پرانی تعلیم کا بھی صرف وہ حصّہ سامنے آیا' جو قدامت پرستی کی آخری حد پر تھا۔

لیکن کیا مولانا ابوالکلام آزاد اس پر قانع ہو گئے تھے یا کیا انھوں نے اپنے والد کی تعلیم کو جاری رکھا؟ حاشا' ان کی باغی فطرت اس پر مطمئن نہ رہ سکی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میری یہی دس گیارہ

Marfat.com

برس کی عمر تھی کہ مجھے اپنے اِردگِرد کے حالات سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ والد کے مریدوں کا آنا اور میرے ہاتھ پانو چُومنا، دوزانو ہوکر مُودب میرے سامنے بیٹھنا اور مجھ سے کچھ پند و نصائح کی توقع کرنا ـــــ یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ یہ لے بڑھ کر رفتہ رفتہ اُن عقائد تک پہنچ گئی، جن کا صبح سے شام تک گھر میں چرچا رہتا تھا۔ جب میں نے اپنے طور پر مختلف مکاتبِ فکر و خیال کی کتابیں پڑھیں، تو والد کے بتائے ہوئے عقائد پر میرا ایمان متزلزل ہوگیا اور جن اصحاب کو وہ کافر گردانتے تھے، مجھے پہلے ان سے ہمدردی اور بعد کو اتفاق پیدا ہوگیا۔

مولانا آزاد کی زندگی کا یہ عبوری دَور خاصا دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ انھوں نے یہ حالات کم و بیش پوری تفصیل سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو بتائے تھے۔ اور ملیح آبادی مرحوم نے یہ اپنی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی کہانی" میں شائع کر دیے ہیں۔[۵]

مولانا آزاد کی یہ داستانِ حیات ان کی بغاوت کا اتنا عظیم الشان اور تعلیمی لحاظ سے اتنا عبرتناک اعتراف ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ چونکہ وہ نفسیات کے ماہر تھے اور مختلف تبدیلیوں اور ان کے وجوہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے ان کا پوری شرح و بسط سے جائزہ لیا ہے۔

بہرحال غالب کی طرح ان کی بھی "دینِ بزرگاں" سے بغاوت ان دونوں کے کردار کی پہلی مماثلت ہے۔

یہ تو دین کی بات تھی۔ لیکن مولانا آزاد کی دنیا میں بھی یہی پیش آیا۔ غالب کی دنیا شاعری تک محدود تھی، جس میں انھوں نے اپنے عمل سے یہ نظریہ پیش کیا

نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است

مولانا آزاد نے سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" جاری کیا۔ اگرچہ اس کا اصلی مقصود دعوت اور مسلمانوں کو اسلام اور عقائد

۵۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ۳۵۲۔۴۲۴ (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۸ ۱۹۵۸ء)

Marfat.com

صحیح کی طرف واپس بلانا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ وہ سیاست سے اپنا دامن بچا کے نکل جاتے۔
یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کا سوادِ اعظم سرسید احمد خان کی تعلیم و تلقین کے زیرِ اثر انگریز پرستی اور کانگریس دشمنی پر گویا متفق تھا۔ سرسید احمد خان کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کا لگایا ہوا پودا پورے برگ و بار سے چھتنار درخت بن گیا تھا۔ اور علی گڑھ اسکول کا ہر طرف بول بالا تھا۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے اس صورتِ حال کے خلاف بغاوت کی اور "الہلال" کے ذریعے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کا انگریزوں کی حکومت پر رضامند ہو جانا اور اُن سے تعاون کرنا اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ انھیں اپنی یہ روش ترک کر کے آزادی کی جنگ میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش کھڑا ہو جانا چاہیے۔ اپنے اس نظریہ پر انھوں نے قرآن و حدیث سے استدلال کیا۔ "الہلال" اور اس کا متبنیٰ "البلاغ" ۱۹۱۵ء تک جاری رہے۔ اس کے بعد انھیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا، جہاں سے وہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں رہا ہوئے۔ اب انھوں نے سیاست کو اپنا ہمہ وقتی مشغلہ بنا لیا اور ملک کی آزادی کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیا۔
یوں انھوں نے غالب کی طرح دین و دنیا دونوں میں بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ دونوں کی زندگی کا ایک اور پہلو سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

غالب کا فروری ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا اور مولانا آزاد اس کے ساڑھے انیس برس بعد اگست ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ دونوں میں زمانے کے لحاظ سے کچھ ایسا طویل فاصلہ نہیں اور دونوں انیسویں صدی ہی کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً جب یہ امر نظر رہے کہ مولانا آزاد کی تعلیم بہت حد تک انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔ اور دونوں کو اس بات کا شدید احساس بھی تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی اہم بات یہ ہے کہ دونوں کی انا بہت شدید اور ہمہ گیر تھی۔ شاعر کا احساسِ انا بالعموم تغزل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غالب نے ایسے ایسے

Marfat.com

طریقے سے تعلّی کی ہے کہ ان کے بیشتر شارحین نے دیوانِ غالبؔ کے اس طرح کے اشعار کے اصلی معنی تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جن اشعار میں انھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف تعلّی کی ہے، وہ آپ سب کے سامنے ہیں مثلاً:

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو، غالبؔ!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

وغیرہ

لیکن متعدد اشعار میں انھوں نے براہِ راست صراحت سے تعلّی نہیں کی، حال آں کہ ان کا مقصد یہی تھا۔ مثلاً کہتے ہیں:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

مقصود اپنی دانائی اور یکتائی کا اعلان تھا۔ لیکن ظاہرا اسے یوں کہا جیسے کہ اپنی بدقسمتی اور محرومی کا تذکرہ کر رہے ہوں۔ کہتے ہیں کہ دنیا میری دشمن اور مخالف اس باعث ہے کہ وہ میری دانائی یعنی قدرتِ کلام اور یکتائی یعنی شعر گوئی میں ہمہ گیری اور بے ہمتائی برداشت نہیں کر سکتی۔

ایک اور شعر دیکھیے:

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس، اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو میں

یہاں اپنے سوائے ساری دنیا کو بے ہُنر اور ہُنر کا قدرناشناس قرار دے دیا ہے۔
ایک اور شعر دیکھیے، کیسے جملہ متقدمین اور معاصرین پر اپنی فضیلت بیان کی ہے۔

Marfat.com

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے!
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

کہتے ہیں کہ میری قابلیت اور بلندی کا شاعر آج تک پیدا ہی کہاں اور کب ہوا! اس پہلو سے میں پہلا شخص ہوں۔ اگر میری مانند پہلے کوئی اور ایسا شخص پیدا ہوا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارے پاس اس کی مثال پہلے سے موجود ہے۔ یعنی جس طرح آپ سہواً دوبارہ لکھی ہوئی عبارت کو فاضل یا غلط قرار دے کر قلمزد کر دیتے ہیں یا مٹا دیتے ہیں۔ آپ یہ سلوک مجھ سے نہیں کر سکتے کیونکہ میں حرفِ مکرّر ہوں ہی نہیں۔ میری شان کا، میری لیاقت اور قابلیت کا کوئی شخص (شاعر) آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ پس مجھے کیوں کر مٹایا جا سکتا ہے!

غرض یہ سلسلہ طویل ہے۔ بس ایک شعر اور سن لیجیے:

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے!

بظاہر اس شعر کا تعلّی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن ہے یہ بھی اسی قبیل کا۔ یہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ میں اتنا بڑا آدمی اور عظیم شاعر ہوں کہ یہ لابد ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر زیارت گاہِ خواص و عوام بن جائے۔ اس طرح لوگوں میں تمھارے گھر کا پتا یوں مشہور ہو جائیگا کہ "وہی گلی جس میں غالب کی قبر ہے" — شعر کو ایک مرتبہ پھر دیکھیے:

اپنی گلی میں، مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے!

تو آپ نے دیکھا کہ انھوں نے کیسے کیسے پہلو بدل کر تعلّی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلّی ہر اس شخص کا خاصہ ہے جسے اپنی برگزیدگی اور عظمت کا اور اسی کے ساتھ زمانے کی بے حسی، ناقدری اور قدر ناشناسی کا احساس ہو۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ دنیا اس طرح میری بزرگی کا اعتراف کرنے اور مجھے میرا حق دینے پر تیار نہیں تو وہ اس "ناانصافی" کے خلاف اور زیادہ احتجاج کرتا ہوا تعلّی پر اتر آتا ہے۔ اور اپنا ڈھنڈورا خود پیٹنے لگتا ہے۔ غالب بھی مایوس ہو کر یہ کہنے پر

Marfat.com

مجبور ہو گئے تھے:

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یعنی ابھی وہ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے جو مجھے سمجھ سکیں اور پہچان سکیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ لیکن زمانے نے ان کے اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ ان کی وفات پر سوا سو سال گزر چکے ہیں اور آج بھی اُن کے کلام کی نئی نئی شرحیں لکھی جارہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے تسلیم کرلیا کہ اُن کے ہمعصر نہ اُن کا کلام سمجھ سکے نہ اس کی صحیح داد دے سکے۔ "وہ گلشنِ ناآفریدہ" جس میں ان کے نغمات کی صحیح داد دینے والے پیدا ہوتے اور جس کی انھیں تمنّا تھی، کہیں اب جاکر، سوا صدی بعد، پیدا ہوا ہے۔

خود غالب کی ساری عمر یہی دلی آرزو رہی اور وہ لوگوں کی محرومی کا ماتم کرتے ہوئے اس جہان سے گزر گئے۔ دیکھیے، کس حسرت سے کہتے ہیں[۶]:

> پنجاہ و دو سال مغزِ سخن کافتم۔ امروز کہ شصت و ششمیں سال ازعمرِ گزراں می گذرد، سخن آفریں را سپاس گزارم و ہم جز آں بخشندۂ بخشایش گرکس نیارد دانست کہ، دریں پنجاہ و دو سال چہ دُرہائے معنی بُردے من کشادہ اند، دگرہی اندیشۂ مرا در فرازستانِ آگہی بکدام پایہ نہادہ اند۔ حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتار مرا نشناختند! مرا خود دل برآناں می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرّۂ ایزدی نگشتند و ازیں نمایش ہائے نظر فروز کہ درنظم و نثر بکار بُردہ ام، سرگراں گزشتند۔ گویی نظیری ہمدردِ من و مقطعِ آں مینو آرامشگاہ نوائے سازِ دمِ سردِ من است:
>
> تو نظیری! ز فلک آمدہ بودی، چو مسیح
> باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت، دریغ!
>
> (میں نے باون برس دماغ سوزی کی۔ اب کہ میری زندگیِ مستعار کا

۶- درفشِ کاویانی: ۱۳۱-۱۳۲ (اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء)

Marfat.com

۶۶ واں برس گزر رہا ہے، میں اُس سخن آفریں خدائے برتر کا شکر ادا کرتا ہوں؛ اور اس بے انتہا بخشنے والے کے سوائے اور کون جانتا ہے کہ ان باون برسوں میں اُس نے کلام کے کیسے کیسے جواہرات مجھے عطا کیے، اور عقل و دانش کے کس بلند مقام پر مجھے سرفراز کیا۔ افسوس کہ میرے ہمعصروں نے میرے کلام کا حُسن نہ پہچانا۔ میرا دل اُن کی نافہمی پر جلتا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت کی شناخت سے محروم رہ گئے اور میری نظم و نثر کے ان حسین شاہکاروں سے سرسری طور پر گزر گئے۔ تم کہو گے کہ نظیری نے یہ شعر گویا میرے ہی لیے کہا تھا:

تو نظیری! زفلک آمدہ بودی چو مسیح
بازپس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ)

کیا اس سے بڑی تعلّی ہو سکتی ہے؟ اور اس کے لکھنے والے کی اَنا کی کوئی انتہا ہے!

غالب کی طرح مولانا آزاد کی اَنا بھی کسی سے مخفی نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ میں اس عہد کا آدمی نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالبؔ چونکہ شاعر تھے، لہٰذا انھوں نے اپنا مافی الضمیر زیادہ تر شعر میں بیان کیا اور وہ بھی اشارے کنایے میں، بالواسطہ طریقے پر — مولانا آزاد نے نثر میں صاف صاف صراحت سے یہی کہہ دیا — "غبارِ خاطر" میں لکھتے ہیں[۷]:

> بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے، جس کی مانگ ہوتی ہے۔ اور چونکہ مانگ ہوتی ہے، اس لیے ہر ہاتھ اُس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اُسے قبول کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل اُلٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی، میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ زمانہ کے بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائینگے، جن کا رواج عام ہو۔ میں نے ہمیشہ

۷۔ غبارِ خاطر" (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن): ۹۲-۹۳

Marfat.com

ایسی جنس ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی، جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لیے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی، وہی میرے لیے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ انھوں نے دکان میں ایسا سامان سجایا، جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں، جس کے لیے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں:

قماشِ دست زدِ شہر و دہ، زمن مطلب
متاعِ من ہمہ دریائی است یا کانی

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں، جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی، جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے:

در کوئے ما شکستہ دلی می خرند و بس
بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگرست

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا:

با رفیقانِ زخود رفتہ، سفر دست نداد
سیرِ صحرائے جنوں، حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہمنفساں را بگزارم
با آبلہ پایاں چہ کنم، قافلہ تیزست

اس تیز رفتاری سے ٹھوکروں میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن عجب نہیں کہ راہ

Marfat.com

کے کچھ خس و خاشاک بھی صاف ہو گئے ہوں:

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منّت بر قدمِ راہ رواں ست مرا

جیسا کہ سب کو معلوم ہے "غبارِ خاطر" قلعہ احمد نگر کی نظربندی کے زمانے کی تصنیف ہے اور اس خط پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ خیال اُنھیں اتنا بعد کو آیا۔ نہیں، وہ یہی بات اس سے بہت پہلے یعنی اکتوبر ۱۹۲۷ء میں غلام رسول مہر کو بھی لکھ چکے تھے:٭

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم، میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی:

ناروا بود، بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری — کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں، اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالامال نہ ہوا ہو۔ بحدّے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔

لیکن افسوس، جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سروسامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی

٭ نقشِ آزاد: ۱۵۰-۱۵۸

Marfat.com

کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالہ کر دیا گیا۔"

دیکھا آپ نے، دونوں کو شکایت ہے کہ ہم اس دَور کے آدمی نہیں تھے۔ غالبؔ کہتے ہیں: میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں۔ وہ باغ ابھی عالمِ وجود میں آیا ہی نہیں، جہاں میری شاعری کے سننے اور سمجھنے والے ہوں گے۔ اور مولانا آزاد کہتے ہیں:

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

غرض غالبؔ اور مولانا آزاد کی افتادِ طبع ایک تھی۔ دونوں کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کا گہرا اور بے پایاں احساس تھا اور دونوں زمانے کی ناشناسی اور ناقدری سے نالاں تھے۔ دلی را ولی می شناسد۔ مولانا آزاد کو گویا اپنی برادری کا ایک اور شخص مل گیا۔ لابُد تھا کہ وہ غالبؔ کا مطالعہ زیادہ غائر نظر سے کرتے۔

یہ اسی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے اس صدی کے آغاز میں جب ہنوز غالبؔ کے آنکنے اور جانچنے کا کام کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا، "الہلال" میں غالبؔ سے متعلق ایک طویل اداریہ قلمبند کیا جو واقعی مطالعۂ غالب اور غالب شناسی کا نقطۂ آغاز بن گیا۔[۹]

مولانا آزاد کی تعلیم عربی اور فارسی سے شروع ہوئی اور وہ بھی کاملاً دینی موضوعات تک محدود رہی۔ وقت کا مسلّمہ نصاب "درسِ نظامی" تھا جو انھوں نے ۱۳۔۱۴ برس کی عمر میں مکمل کرلیا۔ غرض اُن کی اس دَور کی درسی مشغولیتوں میں اردو کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود لکھا ہے، اُنھوں نے اپنے طور پر اردو کے ابتدائی اسباق اپنے والد کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ سے پڑھے اور مشق سے اس میں بتدریج اتنی صلاحیت پیدا کرلی کہ ۱۲ برس کی عمر میں وہ مدراس کے اخبار "جریدۂ روزگار" کا مطالعہ کرنے اور اس سے استفادہ کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے اس پرچے میں حالؔی کی کتاب "یادگارِ غالبؔ" کا اشتہار دیکھا، جس سے

۹۔ الہلال : ۱۷ر جون ۱۹۱۴ء

Marfat.com

کتاب دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُنھوں نے اسے منگواکر پڑھا۔ یہ ان کا غالبؔ سے پہلا تعارف تھا۔ چونکہ اُنھوں نے اس وقت اپنی عمر ۱۳ برس کی لکھی ہے، لہٰذا یہ تقریباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہوگا۔

"یادگارِ غالب" میں برہانِ قاطع کے معرکے کا حال دیکھا تو اس سلسلے کی جملہ کتابیں حاصل کیں۔ کہتے ہیں[۱۰]:

> اس زمانے میں مجھے فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیحِ الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالبؔ نے (قاطع برہان کے) یہ چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

فارسی انھوں نے اپنی تعلیم کے دوران میں پڑھی تھی اور اس کے ادب کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ غالبؔ کے فارسی کلام سے بھی متعارف اور مانوس ہوئے۔

الہلال کے مشاڑ الیہ اداریے کی شانِ نزول یہ تھی کہ وہ دلّی آئے۔ یہاں ان کی نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں کے بڑے صاحبزادے نواب سعید الدّین احمد خان طالبؔ سے ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے یہ باپ بیٹے دونوں غالبؔ کے قریبی عزیز اور شاعری میں اُن کے شاگرد بھی تھے۔ نیّر تو فوت ہو چکے تھے، لیکن طالبؔ یہیں دلّی میں رہتے تھے۔ طالبؔ کے پاس غالبؔ کے اردو دیوان کا جو نسخہ تھا، اس کے حاشیے پر کچھ ایسا کلام درج تھا جو کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے طالبؔ سے یہ نسخۂ دیوان مستعار لیا اور حاشیے کے اس غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ کلکتے واپس جاکر انھوں نے اسے الہلال میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے تعارف کے طور پر یہ اداریہ سپردِ قلم ہوا۔

یہ اداریہ خاصا طویل ہے۔ اس میں انھوں نے غالبؔ کی زندگی کے مختلف واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے؛ خاندانِ مغلیہ کے آخری ایّام کی زبوں حالی اور بہادر شاہ ظفر کی بیکسی اور بےبسی کا ذکر کیا ہے۔ ضمناً ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے کچھ حالات بیان کیے ہیں اور آخر میں

۱۰۔ نقشِ آزاد ۳۳

Marfat.com

فرمایا ہے کہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام جمع کر کے شائع کیا جائے۔ یہ گویا اپنی طرف سے محولۂ فوق کلام کے شائع کرنے کا اعلان تھا۔

جو کلام اُنھیں طالب کے نسخے سے ملا تھا، وہ پہلی مرتبہ الہلال اور البلاغ میں شائع ہوا۔ الہلال کے تین شماروں میں اور البلاغ کے ایک شمارے میں۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

الہلال:

(۱) ۱۰ر جون ۱۹۱۴ء (قصیدہ): کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

(۲) یکم جولائی ۱۹۱۴ء (غزل): ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

(۳) ۲۲ر جولائی ۱۹۱۴ء (غزل): شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرام جان و تن تکیہ

البلاغ:

(۴) ۷، ۲۴، ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء (مشترکہ شمارہ) نواب یوسف علی خاں کے غسلِ صحت کی تہنیت میں قصیدہ۔
مرحبا، سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، کچھ کلام ضائع بھی ہو گیا تھا، جسے وہ شائع نہیں کر سکے۔

لیکن مولانا آزاد کی غالب کے سلسلے میں مہتم بالشان اور قابلِ ذکر یادگار ان کی وہ تعلیقات اور حواشی ہیں، جو اُنھوں نے غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" پر قلمبند کیے تھے۔ ہوا یہ کہ جب مہر نے اپنی کتاب کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ہدیتہً بھیجا تو مولانا نے کتاب دیکھنے کے بعد مہر کو لکھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ غالب کی مکمل سوانح عمری لکھنے والے ہیں، ورنہ میں کچھ یادداشتیں جو میرے علم میں ہیں، لکھ کر آپ کو بھیج دیتا۔ اس پر مہر نے کتاب کا ایک اور نسخہ لیا اور اس کی جلدیوں بندھوائی کہ ہر مطبوعہ ورق کے بعد سادہ کاغذ لگوا دیا اور اسے مولانا

Marfat.com

آزاد کی خدمت میں بھیج دیا تاکہ وہ جب کتاب دیکھیں اور جہاں کہیں اُنھیں کچھ اضافہ کرنا منظور ہو، اسے بہ آسانی سادہ ورق پر لکھ سکیں۔ مہر صاحب کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ مولانا آزاد کی گوناگوں مصروفیتیں، اس پر سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں سفروں کا لامتناہی سلسلہ۔ کتاب کا یہ نسخہ مدتوں اُن کے پاس رہا۔ جب بھی فرصت ملتی، وہ اسے اٹھا لیتے اور کچھ نہ کچھ لکھ دیتے۔ آخر تین برس بعد، ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انھوں نے کتاب مہر صاحب کے پاس واپس بھیج دی۔ مولانا نے جو تعلیقات سپردِ قلم کی تھیں، مہر نے اُنھیں کتاب کی طبعِ ثانی میں اُن کے نام سے شاملِ متن کرلیا۔ (بعد کو انھوں نے یہ سارا مواد مولانا مرحوم کے مجموعۂ خطوط "نقشِ آزاد" میں بھی اضافہ کر دیا تھا)

یہ حواشی ایسے قیمتی اور معلومات افزا ہیں کہ ان سے واقعی مہر کی کتاب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ مولانا آزاد کا اپنا مطالعہ ہی کچھ کم وسیع اور متنوّع نہیں تھا۔ اس پر حافظ اِس بلا کا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا، وہ ہمیشہ کے لیے نہاں خانۂ دماغ میں محفوظ ہوگیا اور مستحضر بھی۔ دوسرے یہ کہ ان کے تعلقات اپنے زمانے کے مشاہیرِ علم و ادب سے تھے۔ ان اصحاب سے انھوں نے جو کچھ غالبؔ سے متعلق سُنا، انھوں نے اسے ان حواشی میں منتقل کر دیا۔ ان حضرات میں لوہارو کے نواب سر امیر الدّین احمد خان بھی تھے۔ اُن سے اُن کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ مولانا آزاد کو غالبؔ کی زندگی کے بارے میں بہت سی تفاصیل نواب صاحب موصوف ہی سے ملی تھیں۔ یہ بھی انھوں نے ان تعلیقات میں محفوظ کر دی ہیں۔ اگرچہ بعد کی جستجو اور تحقیق سے یہ تمام معلومات من وعن درست ثابت نہیں ہوئیں۔ لیکن جتنا کچھ صحیح ہے، وہ بھی نہ مقدار میں کم ہے نہ اہمیت کے لحاظ سے معمولی درجے کا۔ یہ پورا مواد آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے اور اس پر کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں اتنے سارے مختلف علوم مولانا آزاد کے مرہونِ منّت ہیں، وہیں خوش قسمتی سے اردو ادب بھی ان کے رشحاتِ قلم سے محروم نہیں رہا۔ افسوس زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس پر اور اضافہ کر سکتے لیکن جتنا کچھ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ فالحمد للہ۔

Marfat.com

غبارِ خاطر

اس ملک پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہماری پچاس سالہ جدوجہد کا نقطۂ عروج وہ تھا، جسے "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کہا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم ونسق سے فوراً دست بردار ہوکر یہاں سے سدھاریں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اسی لیے اس کے بعد جو تحریک شروع ہوئی، اس کا نام "ہندستان چھوڑ دو" تحریک پڑ گیا۔

اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیونکر صرفِ نظر کرسکتا تھا! اخباروں میں اس طرح کی افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔ اس لیے حکومت نے حفظِ ماتقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۸ اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ جاری رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی رات کے آخری حصے میں یعنی ۹ اگست، علی الصباح حکومتِ وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اُٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کردیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقا احمدنگر کے قلعے میں رکھے

Marfat.com

گئے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔ اولاً اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے، اور یہیں سے بالآخر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ کتاب "غبارِ خاطر" ہے۔ "غبارِ خاطر" مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک چھوڑ کر، ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں، جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال ان کے دل میں شہرۂ آفاق فرانسیسی مصنف اور فلسفی چارلس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "فارسی خطوط" (۱۷۲۱ء) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح — اوزبک اور رجا — فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب و تمدن پر خصوصاً بے لاگ اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں، اسلام اور عیسائیت پر آزادانہ اظہارِ خیال کرتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت تھی۔ اس میں کئی اور سیاسی اور مذہبی مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلمبند نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اس صورت میں تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انھیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھیں کسی شخص واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی تھی جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انھوں نے عالمِ خیال میں انھیں کو مخاطب تصور کر لیا اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی، ان کے خیال میں آتا گیا، اسے بے تکلف حوالۂ قلم کرتے گئے۔ انھیں مضامین یا خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

شروانی خاندان بہت مشہور ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم۔ ہندستان کے اسلامی عہد

Marfat.com

میں اس خاندان کے متعدد افراد بڑے صاحبِ اثر و نفوذ گزرے ہیں، یہاں تک کہ کئی مرتبہ حکومتِ وقت کے ردّ و بدل میں ان کی حیثیت "بادشاہ گر" کی ہوگئی۔ اُن کے اس عہد کے کارنامے ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

لیکن ان کا یہ دَور دَورہ یہاں سلطنتِ مغلیہ کے قیام سے پہلے ہی تک رہا۔ چونکہ ہمایوں کے مقابلے میں شروانیوں نے شیر شاہ سُوری کا ساتھ دیا تھا، اس لیے جب ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلّط جمالیا، تو اب قدرتی طور پر، شروانیوں کا ستارہ زوال میں آگیا۔ ان کی جمعیت شمالی ہند میں منتشر ہوگئی؛ ان میں سے بیشتر نے کمریں کھول دیں اور سپاہ گری کی جگہ کشاورزی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ ان کے زیادہ تر افراد پنجاب کے اطراف اور علی گڑھ اور ایٹہ کے اضلاع میں بس گئے؛ یہاں انھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کرلیں۔

پہلے ان کے ہاتھ میں تلوار تھی، تو اب ہل تھا؛ اس لیے مدتوں ان لوگوں نے قلم سے بہت کم سروکار رکھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے ہمّت کی، تو دینی پہلو سے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ روزمرّہ کے مسائل میں شُدبُد ہوجائے۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی انقلاب کی جو آندھی مغرب سے اُٹھی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاسی استحکام و اقتدار حاصل ہوجانے کے بعد انگریزوں نے یہاں نئے طور طریقے، نئے انتظام، نئی زبان، نئی تعلیم جاری کردی۔ قدرتی طور پر اس کا بہت وسیع اثر ہوا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ آبادی کا کوئی طبقہ اس سے مستغنی رہ سکے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شروانیوں کا رجحان بھی پڑھنے لکھنے کی طرف ہوا، اور انگریزی عہد میں انھوں نے جدید تعلیم سے متمتّع ہوکر ملکی معاملات میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش کام کرنا شروع کیا۔ انگریزی استیلا و اقتدار کے خلاف ہماری جنگِ آزادی میں بھی اس خاندان کے بعض افراد کی خدمات بہت نمایاں اور قابلِ قدر رہی ہیں۔

اسی شروانی خاندان کے گُل سرسبد نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم تھے۔ وہ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء (۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ) کو بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا

Marfat.com

خاندان یہاں اُنیسویں صدی کے اوائل میں آکر آباد ہوا تھا، اور اُن کے آبا و اجداد یہاں کے رئیس تھے۔ ان کے والد محمد تقی خان صاحب (ف ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ) نے اپنے بڑے بھائی عبدالشکور خان کی حینِ حیات خاندانی جاداد اور زمینداری کے نظم و نسق میں کوئی حصّہ نہیں لیا؛ بلکہ خود مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت بھی اپنے تایا صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کی علومِ عربیّہ و فارسیّہ کی متعدد شاخوں میں تعلیم خاص اہتمام سے مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مکمّل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی طرف توجّہ کی، اور اس میں بھی بقدرِ ضرورت خاصی استعداد پیدا کرلی۔ ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات، شروع ہی سے ان کی ذہانت و فطانت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے والد نے موروثی صدر مقام بھیکم پور سے متصل ایک نئی گڑھی تعمیر کی؛ اس کے اندر دلکش باغات لگائے، عالیشان مکان بنوائے، اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ عبدالشکور خان صاحب کا سفرِ حج سے واپس آتے ہوئے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں جدّہ میں انتقال ہوگیا۔ چونکہ چھوٹے بھائی محمد تقی خان صاحب اُن سے دو برس پہلے رحلت کرچکے تھے، اب ریاست کے انتظام کی ذمّہ داری مولانا حبیب الرحمٰن خان کے کندھوں پر آپڑی۔ اسے انھوں نے اپنی خداداد فراست اور دُور اندیشی سے ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ نہ صرف پانچ لاکھ کی مقروض ریاست اس بارِ گراں سے سبکدوش ہوگئی بلکہ اس میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی؛ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع و محل ہے، نہ اس کی ضرورت۔ لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف صاحبِ علم اور علم دوست ہی نہیں تھے، بلکہ ان میں انتظامی قابلیت اور دنیوی سوجھ بوجھ بھی بلا کی تھی۔ دو چیزیں جو بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت جس نہج اور معیار پر ہوئی تھی، اس نے بہت جلد انھیں ملک کے علمی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ ان کا مزاج خالص علمی تھا۔ انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے زرِ کثیر خرچ کرکے حبیب گنج میں ایک نادر اور قیمتی کتاب خانہ جمع کیا، جس کی شہرت ملک سے باہر تک پہنچی۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے اصحابِ مجاز نے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کا صدر مقرر کردیا۔ یہیں سے ان کی شہرت دکن پہنچی، جس پر آصف جاہ ہفتم

Marfat.com

میر عثمان علی خان بہادر نظامِ دکن نے انھیں اپنی ریاست کے اُمور مذہبی کا صدر الصدور بنا کر جون ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد بلوالیا۔ دکن میں اُن کی علمی اور تعلیمی اور دینی خدمات ایسی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، حیدرآباد میں دارالترجمہ اگست ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا تاکہ کتابوں وغیرہ کے ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کا کام کیا جاسکے؛ لیکن عثمانیہ یونیورسٹی اس سے دو سال بعد ۲۸ر اگست ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی۔ اپنی عمارت نہ ہونے کے باعث اس کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں ہوئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اس کے پہلے "شیخ" (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ اسی سال اپنے عہدے کی مناسبت سے اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے 'صدر یار جنگ' خطاب عطا ہوا۔ حیدرآباد میں ان کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

ملک جس سیاسی بُحران اور کشمکش سے گزر رہا تھا' اس کے پیشِ نظر کسی شخص کا سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا ناممکن تھا؛ تاہم نواب صدر یار جنگ نے اس میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا۔ حیدرآباد سے واپسی پر انھوں نے اپنی تمام توجہ ملک کے متعدد تعلیمی اور علمی اداروں کے فروغ و ترقی پر مبذول کردی۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی قابلِ ذکر علمی انجمن ہوگی، جس سے ان کا تعلق نہ رہا ہو۔

مرحوم شاعر اور مصنّف بھی تھے۔ حسرت تخلص تھا۔ اُردو میں منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ فارسی کلام آغا سنجر ایرانی کو دکھاتے تھے؛ کچھ مشورہ خواجہ عزیز لکھنوی اور مولانا شبلی سے بھی رہا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں ــــ اُردو میں کاروانِ حسرت اور فارسی میں بوستانِ حسرت۔ اور بھی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں؛ سیرۃ الصدّیق' تذکرۂ بابر' حالاتِ حزیں' علمائے سلف' نابینا علمار ان میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ بھی "مقالاتِ شروانی" کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔

ان کا بروز جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء (۸ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ) کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ علی گڑھ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلے پر بھموری میں اپنے موروثی قبرستان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں؛ یہ جگہ حبیب گنج سے کوئی میل بھر دور ہوگی۔ اِنّا لِلّٰہ وِاِنّا الیہ راجعون۔

Marfat.com

نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطۃ العقد ثابت ہوئے، جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے ہیں، تو وہ ان کی وسعتِ مطالعہ، ذہن کی براقی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود اُن دنوں حیدر آباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آجاؤ اور الندوہ کی ترتیب و تدوین اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کر سکے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ سال کی تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ کے لگ بھگ۔ مزید یہ کہ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے؛ اور الندوہ بھی یکسر علمی پرچہ تھا۔ ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو اپنا ہمکار بننے اور علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف ان کی اپنی وسعتِ قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خُرد نوازی کا بیّن ثبوت ہے، وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم و فضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدر آباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنو چلے آئے اور یہاں دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاملات کے گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے تجدیدِ دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ (لکھنؤ) کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے مُلاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دورانِ قیام میں دار العلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ اسی لیے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے، تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان تعلقات میں خلوص اور پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ انہی تعلقات کا ایک باب یہ کتاب ہے۔

Marfat.com

(۲)

"غبارِ خاطر" کئی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے:
مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے، اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے، جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، حادثات، نفسیات، کردار، اَمیال و عواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرکات ــ ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے اور کہیں نہیں لکھا؛ اور اُن کے سوانح نگار کے لیے اس سے بہتر اور موثق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوبِ تحریر ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ پختگی نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرورِ زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف اَدوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اُن کے اسلوبِ نگارش کا نقطۂ عروج "غبارِ خاطر" ہے۔ اس کی نثر ایسی نپی تلی ہے، اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بَری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ اُن کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً الہلال اور البلاغ کے دَور میں اُن کے ہاں عربی اور فارسی کے ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ بیشک، ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقۂ علماء کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکینگے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہونگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہوسکتے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے برعکس "غبارِ خاطر" کو دیکھیے تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی و فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دلنشین ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے،

Marfat.com

بلکہ اس سے لطف لیا جا سکتا ہے۔ آپ کہینگے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع سہل ہے، بیشک، یہ توجیہہ ایک حد تک درست ہے؛ لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انھوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ اور ۱۳) یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع ہے ہی یہ۔ ابتدا سے دنیا بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس سے متعلق لکھتے آئے ہیں؛ اور تمام مذاہب کی علتِ غائی اور بنیاد ہی یہ مسئلہ ہے۔ اگر اسی مسئلے پر انھوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں اُن کی جو افتاد تھی، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز اور اُسلوب کیا ہوتا۔ لیکن یہاں انھوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے۔ اس سے جہاں ان کے طرزِ استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے، وہیں اسلوبِ تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ احتیاط سے کانٹے کی تول لکھا ہے۔ کہیں تکرار نہیں ہے، کہیں اُلجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱۰) میں 'انانیت' کا مسئلہ زیرِ بحث آگیا ہے۔ یہ موضوع بھی آسان نہیں؛ اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیوں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے: بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ واقعی اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کر سکتے تھے کہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے وقیع ہو، بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کی حامل ہو کہ ہماری تاریخ ادب کا حصّہ بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں، مثلاً دکایت زاغ و بلبل (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۱۹، ۲۰)۔ بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں، جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانیِ قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۵۴ صفحے قلمبند کر دیے ہیں۔ ان کی دقتِ نگاہ، جزئیات کا احاطہ، غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں

Marfat.com

سے دلچسپی اور ان کی تفصیلات کا علم — غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہلِ ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط (۱۵) لیجیے، جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پھر ان کی باریک بینی اور مسئلے کے مالہٗ و ماعلیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے۔ چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات — ان سب باتوں کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے، یہ چائے نہیں، بلکہ شرابِ طہورا یا آبِ کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی چیز ہمیں دے دی گئی تھی، جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ اُن کے حُسنِ انشا اور قوتِ بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا ہلکا سا فکاہی رنگ ہے جو جابجا الفاظ کا پردہ چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے الہلال میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے، جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا۔ وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوعِ سخن سیاسی چھوڑ، ادبی بھی نہیں؛ لیکن اس میں بھی وہ وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ صفحۂ کاغذ کو کشتِ زعفران بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸)، یا ڈاکٹر سید محمود کا گوریاؤں کی ضیافت کا سامان کرنا (خط ۱۸)؛ یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۲۰) میں قلندر اور مُلّا کا حال — ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کارفرمائیوں نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے: وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے حلقۂ احباب میں سے کم و بیش روز کے ملنے والوں سے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور اپنی معلومات اور تاثرات کو قلمبند کر سکتے ہیں! یہ مولانا آزاد کا کمال ہے کہ انھوں نے ان پرندوں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر اور مُلّا جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہو گئی ہے۔ اور یہ بات صرف پرندوں ہی سے متعلق نہیں ہے، یہ

Marfat.com

تصویر کشی اور مواقع پر بھی ملتی ہے؛ مثلاً باغ میں پھول لگائے ہیں۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا؛ کچھ دن بعد اس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے۔ وہ ان پھولوں کی ابتدا اور نشوونما' ان کی شکل وصورت' حُسن وجمال' دلفریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشمِ تصوّر کے سامنے ایک ہرا بھرا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا' کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علم موسیقی کا' وہ اسے پند وموعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے؛ وہ اسے فوراً کسی کلیے کی شکل دے دیتے اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کر کے احمدنگر لے گئے ہیں' تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے۔ لکھتے ہیں: "اسٹیشن سے قلعے تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے' راہ میں کوئی موڑ نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے؛ جب قدم اُٹھا دیا' تو پھر کوئی موڑ نہیں۔" (ص ۲۰-۲۸) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے۔ سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہی ہے۔ قلعہ جو پہلے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا' اب قریب نظر آنے لگا۔ چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہو گیا اور موٹر کاریں صدر پھاٹک کے اندر داخل ہو گئیں۔ فرماتے ہیں: "غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔" (ص ۲۸) بالآخر زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہو گیا اور پھاٹک بند کر دیا گیا۔ یہ روزمرّہ کا معمولی وقوعہ ہے' اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ لیکن پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے: "اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں' تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں' تاکہ کھلیں۔" (ص ۱۹)

جب پچھلی صدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا' تو امیر بخارا نے حکم دیا تھا کہ ردِّ بلا کے

Marfat.com

لیے مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان کا ورد کیا جائے۔ اُدھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہوگیا لکھتے ہیں: "بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختم خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انھیں کو فائدہ پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (ص ۱۴۹)

چڑیا کا بچہ جو ابھی ابھی گھونسلے سے نکلا ہے، ہنوز اُڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے، ماں کی متواتر اُکساہٹ کے باوجود اُسے اُڑنے کی جرارت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اُڑتا اور فضائے ناپیدا کنار میں غائب ہوجاتا ہے۔ پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اُس کی یہ چستی اور آسمان پیمائی حیرتناک ہے۔ اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں: "جونہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اُٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوگیا کہ "میں اڑنے والا پرند ہوں"، اچانک قالبِ بیجان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی۔" پھر اسی سے یہ حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پر و بالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہوگیا۔ غور کیجیے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے۔" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر پڑے ہیں، اور یہ اُن کی عام روش ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر مفکر ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، جو کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اس کے حصول اور محفوظ رکھنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی؛ اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات علومِ قدیمہ و جدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ ان پر غور و فکر کے دروازے کھُل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے؛ اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ ہیں، اسی قران السعدین کا نتیجہ ہیں۔

Marfat.com

(۳)

مولانا آزاد مکّہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا، وہاں اُردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اُردو میں ہوتی تھی اور جو ہندستانی استاد ان کے پڑھانے کو مقرر کیے گئے تھے، ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اُردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندستان آئے، تو اس وقت مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی، اُردو کی بہت کم واقفیت تھی؛ مزید برآں" اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو مکّہ میں عرب بولتے ہیں"، ان کی زبان پر بھی رائج تھے، جنھیں انھوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا، جو اُردو کا علاقہ نہیں اور اردو مراکز سے بھی دور ہے: اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی، اس لیے اس دوران میں بھی اُردو میں ترقی کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق اور مزاولت اور محنت سے انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔ مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سونچنا (باضافہ نون غنہ) لکھتے ہیں (بولتے بھی اسی طرح تھے)؛ تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً سونچتا (ص ۲۰، ۳۴، ۴۸، ۸۲، ۲۳۶)، سونچنے (۲۰، ۲۴۴)، سونچتا ہوں (ص ۲۴۵)، سونچا (ص ۱۰۶، ۱۶۵)؛ سونچیں (ص ۱۱۴)، سونچ (ص ۱۰۹، ۱۸۶)۔ اسی طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک ہاے ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملیں گی: ڈھونڈھنا (ص ۵۲، ۱۱۱، ۱۲۰)، ڈھونڈھنے (ص ۱۰۰)، ڈھونڈھا (ص ۵۲)، ڈھونڈھی (ص ۹۰، ۲۶۶)، ڈھونڈھیں (ص ۶۹)، ڈھونڈھتے (۶۰، ۶۵، ۸۲، ۲۰۰)، ڈھونڈھتی (ص ۸۱)، ڈھونڈھوایا (ص ۸۰)، ڈھونڈھ (ص ۶۵، ۸۰، ۸۲، ۹۲، ۱۰۰، ۱۰۰)۔ یہ سب شکلیں ملتی ہیں۔ گھاس کو بھی

Marfat.com

پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے اور گھاس ہی فصیح ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۶)۔ بعض لفظوں کے دو دو املا بھی ملتے ہیں مثلاً پاؤں اور پانوں (ص ۸۲، ۹۶) اگرچہ میرا گمان ہے کہ انھوں نے پانوں ہی لکھا ہوگا، پاؤں کاتب کا تصرّف ہے۔ ابتدا میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا؛ الفاظ میں پیش کی جگہ واؤ، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یاے لکھتے تھے۔ یہ دراصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک، جب اتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا، یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ترک ہوگیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم ازکم تین لفظوں میں پرانے رواج کا تتبع کیا ہے۔ اُنڈیل کی جگہ اونڈیل (۶۷، ۱۰۷)، اونڈیلی (ص ۱۰۶)، اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۱)، اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۳۰)؛ اور اوجھن (ص ۲۵۳)۔

کسی زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق و تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے، بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے؛ اسے ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اُردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدّد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا۔ ہم نے بیرونی زبانوں میں سے فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی، اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اُس دَور کی یادگار ہیں، جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مستقل ہوگیا۔ اِکّا دُکّا لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے۔ لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کے ساتھ کچھ ناپسندیدگی اور کراہت کا احساس ضرور رہا۔ اس کے باوجود ان لفظوں کا آنا ناگزیر تھا۔ یہ الفاظ دو حصّوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ اوّل ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئیں اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں، یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی

Marfat.com

اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے۔ لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں؟ ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جاسکتا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دُھند انگریزی الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیے، حال آنکہ اِس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی؛ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سرسید اور اُن کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سرسید کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کردی۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، جن کے لیے ان کے پاس کوئی عذر نہیں تھا۔ مولانا آزاد نے ان خطوط میں انگریزی کے بہت لفظ لکھے ہیں۔ ان میں بہت سے پہلی قسم میں شامل ہیں مثلاً موٹر کار (۱۰) اسٹیشن (۱۳)، ٹرین (۱۲)، ٹائم پیس (۱۳)، سگریٹ کیس (۱۶، ۱۷)، وارنٹ (۱۶)، سول سرجن (۵۲) وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ اب عام طور پر اُردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور انھیں زبان سے خارج کر کے ہم کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دینگے۔ لیکن بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں، جن کے مرادف ہمارے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً پریس (۹۱)، آفس (۵۹)، پریسیڈنٹ (۲۱۱)، میس (۸۷، ۱۹۵)، ٹیبل (۱۳، ۱۶، ۲۴۰) وغیرہ ہیں۔ ان کا مفہوم آسانی سے ہم اپنے موجودہ ذخیرۂ الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں، اور ہمیں قطعی ضرورت نہیں کہ ہم خواہی نخواہی ان سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنائیں۔

زبان کی طرح مصنف کا اسلوبِ بیان بھی بدلتا رہتا ہے، اور بعض حالتوں میں تو یہ اس کے کردار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز پر ہوئی۔ قدرتی طور پر مدتوں ان کا مطالعہ بھی زیادہ تر دینی علوم کا یا عربی فارسی کا رہا۔ لیکن جب انھوں نے انگریزی میں کافی مہارت پیدا کرلی، تو اس کے بعد انھوں نے مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔ اس کا اثر ان کی طرزِ تحریر پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ اب وہ غیر شعوری طور پر انگریزی روزمرہ کا تتبع کرتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں

Marfat.com

سوچ رہے اور اس کے محاوروں، جملوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ "غبارِ خاطر" میں بھی اس کی مثالیں کچھ کم نہیں۔ مثلاً صبح مسکرا رہی تھی (۲۲، ۶۹)؛ یہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے (۵۴)، مشغولیتوں میں گم ہوجاتا ہوں (۷۲)، آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی (۷۲) یہ خیال بس کرتا ہے (۷۷) میرے اختیار کی پسند نہیں تھی (۸۳) حالات کی مخلوق (۹۳)، گردوپیش کے موثرات (۹۳) ۔ یہ سب جملے اور ترکیبیں اپنی ساخت میں بنیادی طور پر انگریزی کی ہیں۔ چونکہ قلعۂ احمدنگر کی نظربندی کے ایام میں عام طور پر انگریزی کتابیں ان کے مطالعے میں رہیں، وہی ترکیبیں ان کے ذہن میں بسی ہوئی تھیں، اور جب وہ یہ خطوط لکھ رہے تھے، لامحالہ تحت الشعور سے ابھر کر انھوں نے اُردو کا جامہ پہن لیا۔

(۴)

غبارِ خاطر پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی۔ اسے جناب محمد اجمل خان نے مرتب کیا تھا؛ اور اس کے شروع میں ان کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ایک زمانے کے بعد لوگوں نے مولانا آزاد کی کوئی تحریر دیکھی تھی، یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ تین مہینے بعد کتاب دوسری مرتبہ اسی سال اگست میں چھپی؛ اور یہ اشاعت بھی سال بھر میں ختم ہوگئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی تھے۔ بدقسمتی سے دونوں مرتبہ کتابت کا معیاری انتظام نہیں ہوسکا تھا اور اسی لیے مولانا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ اسے ان کے ایک دیرینہ مداح لالہ پنڈی داس[۵] نے ۱۹۴۷ء کے فروری میں لاہور سے شائع کیا۔ اس مرتبہ اس میں ایک خط بھی زائد تھا جو پہلی دونوں اشاعتوں میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا؛ یہ سب سے

---

۵ لالہ پنڈی داس کا پنجاب کے پرانے انقلابیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ لاہور کی اوّلین انقلابی انجمن "بھارت ماتا سبھا" کے ممبر، بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ اس انجمن میں سردار اجیت سنگھ (بھگت سنگھ کے چچا) صوفی انبا پرشاد (ایڈیٹر روزنامہ پیشوا)، ایشری پرشاد (نیم سوپ والے) منشی منور خان ساغر اکبرآبادی، دینا ناتھ حافظ آبادی (ایڈیٹر اخبار ہندوستان)، لال چند فلک، مہتہ نند کشور وغیرہ ان کے شریکِ کار تھے۔ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکلتا تھا۔ (پنڈی داس خود بھی ایک پرچہ "انڈیا" گوجرانوالہ سے (باقی اگلے صفحے پر)

Marfat.com

آخری خط موسیقی سے متعلق ہے۔ اب بازار میں اسی تیسری اشاعت کے چوری چھپے کے نقلی نسخے ملتے ہیں؛ اور یہ کتابت کی اغلاط سے پُر ہیں۔

مولانا آزاد مرحوم کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد ساہتیہ اکادمی نے فیصلہ کیا کہ ان کی تمام تحریروں کو جمع کر کے جدید طریقے پر مرتب کیا جائے۔ کام کا آغاز ان کی شاہکار تصنیف ترجمان القرآن سے کیا گیا۔ کتاب کی مولانا آزاد کی زندگی میں دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ ساہتیہ اکادمی نے انھیں چار جلدوں میں تقسیم کر دیا۔

غبارِ خاطر کی ترتیب میں مجھے سب سے زیادہ دقت مختلف کتابوں اور اشعار کے حوالوں کی تلاش میں ہوئی۔ مرحوم لکھتے وقت اپنے حافظے سے بےتکلف کتابوں کی عبارتیں اور شعر لکھتے چلے جاتے تھے۔ جہاں تک معروف شعر اور مطبوعہ دواوین کا تعلق ہے، ان سے رجوع کرنا چنداں دشوار نہیں تھا۔ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے شعر کسی تذکرے میں دیکھا تھا یا کہیں اور، میں نے حوالے دواوین سے دیے ہیں۔ آپ دیکھینگے کہ بہت جگہ لفظی تفاوت ہے۔ بعض اوقات وہ موقع کی ضرورت سے دانستہ بھی ردّ و بدل کر لیتے ہیں لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے جہاں اسے دیکھا تھا، وہاں یہ اسی طرح چھپا ہو۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اسے جوں کا توں محفوظ نہ رکھا ہو۔ اس صورت میں انھوں نے اس میں ایک آدھ لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھ دیا۔ چونکہ خود موزوں طبع تھے، شعر ساقط الوزن تو ہو نہیں سکتا تھا، البتہ اصل متن قائم نہ رہا۔

(۵)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتابت سے متعلق بعض باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔

(بسلسلۂ گذشتہ) نکالتے تھے۔ اس سبھا کے جلسے باقاعدہ ہوتے جن میں جوشیلے اراکین حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے اور لوگوں کو ابھارنے کے لیے نظم و نثر میں آگ اگلتے تھے۔

جب مئی ۱۹۰۰ء میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو گرفتار کر کے مانڈلے (برما) میں نظر بند کر دیا تو اسی زمانے میں پنڈی داس اور نند کشور کو بھی پانچ سال کے لیے کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۶۵ء کو دلی میں انتقال ہوا۔

Marfat.com

اُردو میں متعدد لفظوں کے لکھنے میں بہت بے احتیاطی کا رواج سا ہوگیا ہے۔ مثلاً عام طور پر فارسی کے حاصل مصدر ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے آزمائش، ستائش، افزائش وغیرہ۔ یہاں ہمزہ غلط ہے، یہ تمام الفاظ یائے سے ہونا چاہییں۔ یعنی آزمایش، ستایش، افزایش وغیرہ۔ اسی طرح فارسی مرکبات توصیفی و اضافی میں اگر موصوف یا مضاف کے آخر میں یائے ہو، تو اس پر ہمزہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر صلاے عام، پاے خود، جاے مہمان میں کسی جگہ بھی یائے پر ہمزہ لکھنا درست نہیں۔ ہاں، اگر یہ یائے معروف ہو، تو اس صورت میں اس کے نیچے زیر لگانا چاہیے مثلاً رعنائیِ خیال، بیماریِ دل وغیرہ۔

اُردو کے وہ لفظ جو امرِ تعظیمی کی ذیل میں آتے ہیں جیسے کیجیے، کیجے، ڈریے یا جمع ماضی کے صیغے مثلاً دیے، لیے وغیرہ؛ ان میں بھی ہمزہ نہیں، بلکہ آخر میں یائے ہے؛ یہی حال چاہیے کا ہے۔ ہمارے ہاں تحریر میں رموزِ اوقاف کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض اوقات اس سے بہت الجھن پیدا ہوجاتی ہے اور عبارت کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ آپ کو انگریزی کی کوئی معیاری کتاب رموزِ اوقاف کے بغیر نہیں ملیگی۔ یہ قابلِ تقلید روش ہے۔ ہمارے لکھنے والوں اور ناشروں کو اس پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے۔ اُردو میں چونکہ اس کا رواج نہیں، اس لیے یہ فیصلہ کرنا بھی دشوار ہے کہ کہاں کونسا نشان رکھنا چاہیے۔ اگر یہ استعمال عام ہوجائے، تو رفتہ رفتہ یہ تعیین بھی ہوجائیگی۔

Marfat.com

تذکرہ

"الہلال" کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا، جب مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر ۲۴ سال سے بھی کم تھی۔ یہ محض ایک ہفتہ وار جریدہ نہیں تھا، بلکہ ایک دعوت تھی — مذہبی، سیاسی، ادبی۔ جس تیزی سے اس نے ان میں سے ہر ایک میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی، وہ حیرتناک تھی اور آج تک بےنظیر بھی ہے۔ سیاسی میدان میں یہ پہلی آواز تھی، جو علی گڑھ اسکول کی کانگریس دشمنی اور انگریز دوستی کے خلاف بلند ہوئی۔ اس سے پہلے کسی کو اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ سرسید کی پالیسی کو جو ۱۸۵۷ء کے غیر معمولی حالات کا نتیجہ تھی، کھلم کھلا تقویم پارینہ کہہ کر اسے ترک کر دینے کی تلقین کرتا۔ الہلال نے پوری جرأت اور قوت سے اس طریقۂ کار کی فرسودگی اور بےمقصدیت کو بےنقاب کرنا شروع کیا۔ الہلال کی اس تعلیم کی تہ میں جو رجحان کام کر رہا تھا اور اس سے جو خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے تھے، حکومت وقت بھی اس سے بےخبر نہیں تھی۔ لیکن چونکہ یہ ساری تعلیم دینی لباس میں پیش کی جا رہی تھی، وہ اس کے جواں سال مدیر کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے ہچکچاتی تھی۔ لیکن تا کے! بالآخر حکومت نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں حادثۂ مسجد کانپور کے ہنگامے کے زمانے میں ایک مضمون پر الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی، جو فوراً پیش کر دی گئی۔

اگلے ہی برس یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ اب الہلال کے تیز و تند

Marfat.com

مضامین حکومت کی نظر میں باغیانہ ٹھہرے۔ اخبار پانیر (الہ آباد) نے، جو اُس عہد میں گویا انگریزی حکمتِ عملی کا نفسِ ناطقہ تھا، حکومت کو توجہ دلائی کہ الہلال درپردہ جرمنی کا حامی ہے، اور حکومت اس کے مخالفانہ رویّے سے چشم پوشی یا سہل انگاری کرکے دانشمندی کا ثبوت نہیں دے رہی ہے۔ ممکن نہیں تھا کہ حکومت، پانیر کی اس تنبیہ کو نظر انداز کر دیتی۔ اس کے دو ہفتے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں حکومت نے الہلال کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لی۔ اس پر مولانا آزاد نے اخبار بند کر دیا۔ آخری پرچے پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ چھپی ہے۔

ایک سال بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں انھوں نے ایک دوہزار پرچہ البلاغ کے نام سے جاری کیا۔ یہ صرف نام کے لحاظ سے نیا تھا، ورنہ شکل و صورت، مضامین و مواد، اسلوب و استدلال —— غرض ہر بات میں یہ الہلال کا نقشِ ثانی ثابت ہوا۔ اب جنگ اپنے پورے شباب پر تھی، اور انگریز ہر محاذ پر پسپا ہو رہے تھے۔ مولانا کے اندازِ فکر و تحریر میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بلکہ 'ذوقِ نغمہ' کی کمی نے اُن کی 'نوا تیز تر' کر دی تھی۔ حکومت اخبار کی جارحانہ تحریروں سے درگزر نہ کر سکی۔ آخرکار ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے انھیں ایک ہفتے کے اندر حدودِ بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ اس پر انھوں نے مجبوراً رختِ سفر باندھا۔ وہ ۳۰ مارچ کو کلکتہ سے نکلے۔ روانگی سے پہلے وہ البلاغ کا وہ پرچہ مرتب کر چکے تھے، جس پر ۳ اپریل ۱۹۱۶ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی کلکتے سے غیر حاضری سے پرچے کی اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا؛ اس کے جاری رکھنے کے لیے ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ پرچہ اس کے بعد جاری نہ رہ سکا؛ اور یہی ۳ اپریل کا پرچہ آخری شمارہ ثابت ہوا۔

چونکہ پنجاب، یوپی وغیرہ کی حکومتیں پہلے ہی ان کا اپنے ہاں داخلہ ممنوع قرار دے چکی تھیں، اس لیے بنگال سے نکل کر اب انھیں بہار میں رانچی کے باہر ایک گانْو مورآبادی میں پناہ لینا پڑی۔ تین ماہ بعد ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے وہیں رانچی میں ان کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے۔

Marfat.com

الہلال اور اس کے بعد البلاغ کے مہتمم ایک صاحب فضل الدین احمد مرزا تھے؛ جب بعد کو مولانا آزاد نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی مدد سے پیغام جاری کیا تو اس کے منیجر بھی وہی مقرر ہوئے۔ وہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کے ایک دیہات کے رہنے والے تھے۔[1] انھوں نے جاپان میں انجنیری کی تعلیم پائی تھی۔ جب وہاں سے لوٹے تو کلکتے چلے گئے، جہاں ان کے بھائی پہلے سے غالباً انجنیر نگ ہی کے محکمے میں ملازم تھے۔ یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد ہنوز تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے دوستی کی شکل اختیار کرلی جس میں زمانے کے ساتھ استواری پیدا ہوگئی۔ جب مولانا آزاد رانچی میں نظر بند ہوئے، تو فضل الدین احمد مرزا نے باصرار انھیں اپنی سرگزشت لکھنے پر رضامند کرلیا۔

مولانا نے جب لکھنا شروع کیا، تو ابتدا اپنے بزرگوں کے حالات سے کی۔ مسوّدہ خاصا ضخیم ہوگیا۔ اسے مناسب حدود میں رکھنے کی خاطر فضل الدین احمد مرزا نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ پہلا حصہ بعد کو 'تذکرہ' کے عنوان سے ۱۹۱۹ء کے آخر میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے اپنے پردادا شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ دراصل پوری کتاب کا پہلا باب ہے، جو سرتاسر حضرت شیخ جمال الدین کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں، جو شائع نہ ہوسکا، شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات تھے۔ تیسرے باب میں ان کے پردادا شاہ محمد افضل کے اور والد مولانا محمد خیرالدین کے نانا مولانا منورالدین کے سوانح حیات تھے۔[2] ان کے علاوہ مسوّدے کے کئی طویل حواشی بھی انھوں نے روک لیے تھے۔[3] یہ سارا مواد وہ دوسرے حصے میں شائع کرنے والے

۱۔ فضل الدین احمد مرزا صاحب سے متعلق جو تفصیلات دی گئی ہیں، یہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب ذکرِ آزاد (۱۰۵-۱۱۰) اور مولانا غلام رسول مہر کے ایک خط پر مبنی ہیں۔

۲۔ دیکھیے تذکرہ: (فضل الدین احمد مرزا کا نوٹ): ۳۰۸-۳۰۹ (ساہتیہ اکادمی ایڈیشن: ۱۹۶۸ء)

۳۔ ایضاً (مقدمہ): ۲۲

Marfat.com

تھے۔ لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کرلی کہ وہ مولانا کی رہائی سے پہلے ہی کلکتہ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ لدھیانہ میونسپل کمیٹی میں سکتر کے عہدے پر فائز تھے۔ جب ترکِ موالات کی تحریک نے زور پکڑا، تو وہ بھی ملازمت ترک کرکے اپنے وطن چلے گئے، جہاں غالباً ۱۹۲۲ء میں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ مولانا آزاد نے اپنی زندگی میں بقیہ مسوّدہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی؛ ایک خاص آدمی تک مرزا صاحب مرحوم کے مکان پر بھیجا کہ ان کے لواحقین اور پسماندگان سے اس کا کھوج نکالے، لیکن بیسود؛ یہ دستیاب نہ ہوا۔

مولانا آزاد کو اس کتاب کی تصنیف میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ جیسا کہ خود فضل الدین احمد مرزا صاحب نے لکھا ہے[۴]۔ یہ جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کے درمیانی پانچ مہینے میں قلمبند ہوئی۔

یہی نہیں، مولانا نے اس کتاب میں اپنی کچھ مزید تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً

۱ 'حقیقتِ ایمان وکفر ونفاق' پر ایک رسالہ[۵]

[اس کا امکان ہے کہ یہ رسالہ تذکرہ سے پہلے لکھا جاچکا تھا]

۲ سیرۂ نبویہ ماخوذہ من القرآن[۶]

[یہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی تصنیف تھی]

۳ تحصیل السعادتین[۷]

[یہ رسالہ بھی غالباً پہلے سے لکھا ہوا موجود تھا۔ اس میں یونانی اور عجمی فلسفے کی اسلامی علوم میں ملاوٹ اور اس کے خطرناک اور افسوسناک نتائج کا بیان تھا]

۴۔ ایضاً: (مقدمہ): ۱۸ ۵۔ ایضاً (متن: ۱۸۹ (حاشیہ)

۶۔ ایضاً: (متن): ۲۰۵

۷۔ ایضاً: ۲۱۷ (حاشیہ)

Marfat.com

۴ سیرۃ امام احمد بن حنبلؒ

۵ شرح نامۂ وصیت امام احمد بن حنبلؒ

[۴ و ۵ : یہ دونوں البلاغ میں اشاعت کے لیے لکھنا شروع کی تھیں۔ لیکن تکمیل سے پہلے کلکتہ سے اخراج کا حکم نافذ ہوگیا اور البلاغ بھی بند ہوگیا؛ غالباً یہ مکمل نہ ہوسکیں]

۶ مقدمۂ تفسیر[۹]

[یہ بھی تذکرہ سے پہلے مکمل ہوچکی تھی]

۷ رسالہ اتحاف الخلف[۱۰]

[یہ بھی پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں ہستیِ باری تعالیٰ سے بحث کی تھی، اور دکھایا تھا کہ خدا کی ذات وصفات کا ادراک عقل سے ممکن نہیں، جو ماورائے محسوسات ہے۔ مذہب اور علومِ عقلیہ دونوں ہی غیر حسی چیزوں کے ادراک سے عاجز ہیں؛ ایمان بالغیب ہی سلامتی کی راہ ہے[۱۱]]

۸ الکلم الطیب والقول الثابت[۱۲]

(پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں مذہب اور عقل کی باہمی آویزش پر بحث کر کے دکھلایا ہے کہ قرآن کی تعلیم کسی پہلو سے بھی عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس تعلیم کے دو حصے ہیں: اعمال وعقائد؛ اعمال جن کا تعلق زندگی سے ہے، وہ تو عقل کے عین مطابق ہیں ہی۔ عقائد ماورائے مادیات اور اسی لیے ماورائے عقل ہیں؛ یہ بھی ضدِ عقل نہیں۔ پس اسلام میں سرے سے عقل سے کوئی چپقلش ہے ہی نہیں[۱۳]۔)

۸۔ ایضاً : ۲۱۹ - ۲۲۰ (حاشیہ)

۹۔ ایضاً : ۲۴۴

۱۰۔ ایضاً : ۲۴۴

۱۱۔ ذکرِ آزاد : ۲۸۶ (کلکتہ ۱۹۶۰ء)

۱۲۔ تذکرہ : ۲۴۴

۱۳۔ ذکرِ آزاد : ۲۸۴

Marfat.com

۹ سیرۃ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[۱۴]

[پہلے کی تصنیف ہے]

۱۰ سیرۃ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی[۱۵]

["تذکرہ" کی تصنیف کے دوران ہی میں قلمبند ہوئی تھی۔ اس میں متوسط تقطیع کے ۱۰۳ صفحات تھے؛ اور اس کے لکھنے میں ایک ہفتہ صرف ہوا تھا]

۱۱ شرح حدیث غربت[۱۶]

[حدیث بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء کی تشریح وتوضیح]

چونکہ "تذکرہ" کی تصنیف کے آغاز سے پہلے انھوں نے فضل الدین احمد مرزا سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس دوران میں جو کچھ بھی لکھا جائیگا وہ انھیں کے سپرد ہوگا[۱۷]؛ اس لیے سیرۃ شیخ احمد سرہندی بھی انھیں کے پاس بھیج دی گئی تھی؛ اور افسوس کا مقام ہے کہ "تذکرہ" کے بقیہ مسودہ کی طرح یہ بھی ضائع ہوگئی۔

"تذکرہ" الہلالی دَور کی تصنیف ہے۔ انداز اس کا بھی بالواسطہ طور پر دعوت ہی کا ہے۔ اس کی زبان بھی عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہے۔ اس میں بھی وہی بات سے بات پیدا کرنے کا رجحان، جولانیِ طبع، خطابت، اور دعوت وتبلیغ کا انداز ملتا ہے، جو الہلال اور البلاغ کا مابہ الامتیاز بلکہ طرۂ افتخار تھا۔ بلکہ یہاں وہ مَے دو آتشہ ہوگئی ہے۔ پوری کتاب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اکابر کا جانشین خیال کرتے ہیں، جن کی عزیمتِ دعوت کو وہ دنیا کے سامنے عموماً اور مسلمانوں کے سامنے خصوصاً بطور نمونہ واُسوہ پیش کر رہے ہیں۔ تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں مولانا آزاد کے جدِ امجد شیخ جمال الدین سے متعلق

۱۴۔ تذکرہ: ۲۴۴

۱۵۔ ایضاً: ۲۶۵ (حاشیہ)

۱۶۔ ایضاً: ۲۷۸ - ۲۷۹ (حاشیہ)

۱۷۔ ایضاً: ۲۶۵ (حاشیہ)

Marfat.com

لکھا تھا: بااہلِ دنیا کارے ندارد، بافادہ و افاضۂ طلّابِ علم مشغول است (منتخب التواریخ، ۳ : ۱۱۳)۔ اس پر لکھتے ہیں[۱۸]:

> یہ شہادت دیکھ کر طبیعت کو نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب و کیفِ دماغ کا باعث ہوا کہ الحمد للہ علمِ حدیث و سُنّت کی خدمت و چاکری کی سعادت سے ہمیشہ یہ خاندان ممتاز رہا ہے۔ اور برنگِ محدثین، ذوقِ سُنّت اور "با اہلِ دنیا کارے نہ داشتن" کی دولت ابتدا ہی سے ہم خاک نشینانِ فقر و نامرادی کے حصّے میں آئی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرّغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہنچے اور یہ سرمستیِ پارینہ داروے تازہ سے ترکیب پاکر ہنگامۂ گزشتہ اور شورشِ رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کا عالم از سرِ نو پھر تازہ کردے:
>
> بہ بدمستی سزد، گر متّہم سازد مرا ساقی
> ہنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بودارد

ایک اور مقام ملاحظہ ہو:

عشقِ مجازی میں ناکامی اور اس کے سود و زیاں کی داستان بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں[۱۹]:

> زمانے کو کل تک جہاں پہنچانا چاہا تھا، الحمدللہ اب خود اس سے بھی منزلوں آگے بڑھ چکے ہیں؛ اور گو ہمرہانِ راہ اب تک اُسی منزل میں کمریں کھولے بیفکر پڑے ہیں، مگر اپنا کاروانِ طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے۔
>
> مَے کہ می رود امروز در گلوے دوکون
> کمینہ جرمۂ تہ شیشہ ہاے دوشِ منست

۱۸۔ دیکھیے تذکرہ : ۳۰۲ ۱۹۔ تذکرہ : ۳۳۵

Marfat.com

یہ سطریں پڑھنے سے معاً خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پَر تول رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس کی بنیاد دراصل ۱۹۱۳ء میں پڑی، جب انھوں نے 'حزب اللہ' کی بنیاد رکھی تھی[۲۰]؛ اور یہ اسی کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنی امامت پر بیعت لینے کے لیے مختلف صوبوں میں داعی مقرر کر دیے[۲۱]۔ معاملہ خاصا آگے بڑھ چکا تھا؛ لیکن ان کی فراست اور دور اندیشی کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اس پُرخار راہ سے دامن بچا کر نکل گئے۔ اگر خدانخواستہ وہ اس آزمایش میں پورے نہ اُترے ہوتے، تو نہیں معلوم ان کا کیا حشر ہوتا۔ میں اسے واقعی ان کی کرامت خیال کرتا ہوں کہ وہ اس حد تک جانے کے بعد بھی صحیح سلامت واپس آ گئے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے لکھا تھا[۲۲]:

> اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولانا خود اس سے دستکش نہیں ہوئے تھے، بلکہ علماے دیوبند کی سخت مخالفت کے باعث۔ دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں مولانا کی امامت کا رزولیوشن منظور نہ ہو سکا تھا۔ مولانا کو طبعی طور پر اس کا بڑا صدمہ تھا۔ اور غالباً اسی بددلی اور بیزاری کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے علماے دیوبند کی مخالفت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے متاثر ہو کر مولانا آزاد نے "اپنا راستہ بدل دیا۔" مولانا اکبرآبادی کو غلط فہمی ہوئی۔ اور یہ ان کے مولانا آزاد کے کردار کی افتاد کے نہ سمجھنے پر دال ہے۔ مولانا آزاد نے اپنا رستہ کبھی نہیں بدلا۔ انھوں نے روزِ اوّل امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل کرنے اور قرآن وسنّت کی دعوت کی اشاعت کو اپنا

۲۰۔ حزب اللہ کی تاسیس کا ذکر سب سے اوّل الہلال کے دسمبر ۱۹۱۳ء کے شماروں میں ہے۔ کچھ تفصیلات ۱۹۱۴ء کے شماروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

۲۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے، ذکرِ آزاد: ۲۳-۲۷ ۲۲۔ ماہنامہ برہان، دلی ستمبر ۱۹۶۸ء

Marfat.com

نصب العین قرار دیا تھا۔ اور پھر عمر بھر وہ اسی رستے پر چلتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے نہ کبھی پیچھے کی طرف مُڑکر دیکھا، نہ دائیں بائیں کی کوئی اور کشش اور ترغیب انھیں اس راہ سے ہٹا سکی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے جو کچھ کیا، اسی مقصد کے حصول کے لیے کیا۔ افسوس کہ اس موضوع پر کسی تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں، ورنہ امثال و شواہد سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جو مقصدِ حیات اپنے سامنے ۱۹۰۳ء میں رکھا تھا، اپنی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء) تک وہ پوری ثابت قدمی سے اسی پر قائم رہے۔

لیکن مولانا اکبر آبادی کا یہ کہنا کہ مولانا آزاد امامت کے دعوے سے خود دستکش نہیں ہوئے تھے، بلکہ علماے دیوبند کی سخت مخالفت کے باعث، تو اسے ایک اور پہلو سے دیکھیے۔

یہ ثابت ہے کہ مولانا آزاد نے مختلف صوبوں میں اپنی امامت پر بیعت لینے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جب انھوں نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں بیعت لینے کی اجازت دی، اور انھیں بتایا[۲۳] کہ بیعت کا کام دوسرے صوبوں میں جاری ہو چکا ہے، جسے دوسرے لوگ کر رہے ہیں؛ یوپی کا صوبہ تم اپنے ذمے لے لو۔ گویا کم از کم شمالی ہند میں لوگوں کی ایک "معقول تعداد" ان کی امامت پر متفق ہو چکی تھی۔ اگر وہ چاہتے، تو "علماے دیوبند کی سخت مخالفت" کے باوجود ان مبایعین کے بل بوتے پر بآسانی اپنی امامت کا اعلان کر سکتے تھے۔ آخر آج جو بیشمار فرقے ملتے ہیں، یہ کس طرح وجود میں آئے۔ اور ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہے! لیکن ایسا کرنا مولانا آزاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ امت میں تفرقہ اور گروہ بندی کے خلاف تھے۔ ان کا اصول "وصل" تھا، نہ کہ "فصل"۔ اسی لیے انھوں نے نفسِ امّارہ کی نہیں سنی، اور اس دعوے سے دست بردار ہو گئے۔ اسی لیے، میں نے کہا کہ اس حد تک کامیابی کر لینے کے بعد بھی ان کا یہ اقدام کسی طرح کرامت سے کم نہیں تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔

۲۳۔ ذکرِ آزاد۔ ۲۴ - ۲۵

Marfat.com

فضل الدین احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے[۲۴]:

ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے، اس کے مقابلے میں اب اُن کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں، تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

یہ بہت اوچھی بات تھی۔ قدرتاً اقبال مرحوم کو اسے پڑھ کر رنج ہوا؛ انھوں نے اس کی مولانا سید سلیمان ندوی سے بدیں الفاظ شکایت کی[۲۵]:

مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" آپ کی نظر سے گزرا ہوگا؛ بہت دلچسپ کتاب ہے؛ مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد مرزا لکھتے ہیں: "اقبال کی مثنویاں الہلال کی بازگشت ہیں"۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میرے مطبوعہ تحریریں منظم و نثر — انگریزی و اُردو میں موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا؛ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے، نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال، تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا؛ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کر دیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے؛ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی؛ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سُنے گئے۔ ان میں اور مثنویوں میں زمین و

۲۴۔ تذکرہ (مقدمہ): ۱۶

۲۵۔ دیکھیے اقبال کا خط، معارف جلد ۳، شمارہ جون ۱۹۵۴ء: ۴۶۹

Marfat.com

آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں، انھوں نے کیا سُنا، اور سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں، مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں، ورنہ یہ موخرالذکر شکایت براہِ راست اُن سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو، تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجیے۔

ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کسی عنوان فضل الدین احمد مرزا صاحب کی تحریر اور رائے کے لیے ذمہ دار نہیں گردانے جا سکتے، بالخصوص جب کہ کتاب کی اشاعت ہی ان کی اجازت اور اطلاع کے بغیر ہوئی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ فضل الدین احمد مرزا کا مقدمہ اس صورت میں کتاب کے ساتھ چھپے۔ اس کے باوجود جب سیّد سلیمان مرحوم نے انھیں ڈاکٹر اقبال کے محولۂ فوق خط کی طرف توجہ دلائی، تو مولانا آزاد نے سیّد صاحب کو لکھا:[۲۶]

> ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں، تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس تذکرہ کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظرثانی کے لیے بھیجا تھا، اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصّہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے؛ اور میں مُصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے صرف اتنا ٹکڑا احد درجہ ضمنی مطوّلات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہٖ چھاپ کر جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیج دیا: اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ

۲۶۔ مولانا آزاد کا خط، معارف جلد ۲، شمارہ نومبر ۱۹۵۳ء : ۳۸۹

Marfat.com

اس مرتبہ جب وہ جلسہ کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا؛ حال آنکہ میں نے جو بات کہی تھی۔ وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے، اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

یقین ہے کہ اس خط کا اقتباس مولانا سید سلیمان مرحوم نے اقبال کے پاس بھیجا ہوگا۔ اور چونکہ اس کے بعد انھوں نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔ اس سے اتنا ثابت ہے کہ یہ دل آزار تحریر نہ مولانا آزاد کی اجازت و استصواب سے شائع ہوئی، نہ وہ اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

کچھ کرنے کے کام

تمام دوسرے لوگوں کی طرح ہم مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق بھی دو پہلوؤں سے لکھ سکتے ہیں. اوّل، ان کے سوانح حیات ہیں، جن میں ان کے خاندان کا تذکرہ اور اُس ماحول کا ذکر ہوگا جس میں ان کی پیدائش ہوئی اور انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے۔ انھیں کی روشنی میں ان کے اخلاق و عادات اور کردار کی تشکیل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے، ان کے کام اور کارنامے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے کن میدانوں میں کام کیا اور ان میں کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

جہاں تک ان کے سوانح حیات کا تعلق ہے، اس بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، اور چھپ کر ہمارے سامنے آیا ہے، میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ بنیادی طور پر تمام کوائف ہمارے علم میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ تحقیق و تجسّس سے ان کی ابتدائی زندگی کی بعض جُزوی تفصیلات سے متعلق کوئی نئی بات منظرِ عام پر آجائے، ورنہ کسی اہم واقعے کے اضافے کے امکانات اب بہت کم ہیں۔ خود مولانا آزاد اپنے بارے میں بہت کم گو تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے حالات تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ایک دوست کی فرمایش پر وہ اپنی سوانح عمری لکھنے پر آمادہ بھی ہوئے تو "تذکرہ" میں اپنے متعلق چند اشارے کر کے رہ گئے، جو اسی زمانے میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی

Marfat.com

مرحوم نے ان سے متعلق دو کتابیں شائع کیں۔ "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" اور "ذکرِ آزاد"۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور مولانا امداد صابری نے بھی ان کی سوانح عمریاں قلمبند کی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ساہتیہ اکادمی سے "سلسلۂ اکابر ادب" میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی لکھی ہوئی مختصر کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسی موضوع پر ایک مفصل کتاب بھی لکھی ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی ایک تفصیلی کتاب انگریزی میں میرے ایک اور دوست لکھ رہے ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۸۹ء کے اواخر تک شائع ہو جائیگی۔ ایک انگریز مصنّف کا لکھا ہوا انگریزی مقالہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ جہاں تک ان کی سوانح عمری کا تعلق ہے، ہم اس مطبوعہ مواد پر بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک ایک پہلو ایسا ہے، جس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اور اسی پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نابغۂ روزگار شخصیت اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے متعدد میدان تھے اور وہ ہر جگہ منفرد مقام کے حامل۔ وہ صحافی تھے، ادیب اور انشا پرداز تھے، عالمِ دین تھے، مفسرِ قرآن تھے، مفکّر تھے، سیاست دان تھے، تحریکِ آزادی کے ممتاز سپاہی تھے۔ حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کی ان گوناگوں سرگرمیوں پر بہت کم لکھا گیا ہے، حال آں کہ میرے نزدیک کرنے کا یہی کام تھا۔

دعوت الہلال

مولانا آزاد اپنی خاندانی روایات اور تعلیم کے زیرِ اثر ایک عالمِ دین ہی کی حیثیت میں ملک سے متعارف ہوئے۔ مدتوں ان کی تحریروں کا محور اسلام کی افہام و تفہیم ہی رہا۔ اور لوگوں نے اُنھیں اسی صورت میں جانا اور مانا۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات کیں، اور اسلام کی تعبیر و تفسیر اور "مسلماں را مسلماں باز کردند" کے سلسلے میں جو رول ادا کیا، وہ اتنا اہم

Marfat.com

ہے کہ ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کوئی اسے مانے یا نہ مانے کہ یہ "الہلال کی دعوت" کا اثر تھا' اور الہلال ہی نے وہ زمین تیار کی تھی جس پر بعد کو جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت نے اپنی اپنی عمارت کھڑی کی۔

افسوس کہ یہ موضوع آج تک تشنۂ تحقیق ہے۔ الہلال کی دعوت کا عمیق اور وسیع مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے کہ اس نے ہر ہفتے کیا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اور وہ کس طرح کے کے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں رہا۔ الہلال کی عمر بہت کم رہی' لے دے کے یہی تین برس یا کچھ زیادہ۔ لیکن اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر اس کی اشاعت غیر معمولی تھی۔ یہ ہر ہفتے ۲۰-۲۵ ہزار چھپتا تھا۔ گویا اس کے قارئین ایک لاکھ کے قریب ہونگے۔ اسی لیے اس کے اثرات اور نتائج بہت دُوررس اور پایدار ثابت ہوئے۔

تقابلی مطالعے سے دیکھنا چاہیے کہ جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار اور مقاصد نے الہلال کی دعوت سے کس حد تک فائدہ اُٹھایا۔ مطالعے کے دوران میں انحراف اور ردّوبدل کے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ الہلال کی دعوت کی اہمیت کم ہوتی ہے' نہ ان تحریکوں کے اس سے متاثر ہونے کی تغلیط۔

سیاسی اصلاح

الہلال کی دعوت کا دوسرا محاذ سیاسی تھا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر جو افتاد پڑی' وہ تاریخ کا حصّہ ہے۔ اس کا وقتی علاج سرسیّد احمد خان مرحوم نے اپنی بصیرت کی روشنی میں پوری دیانتداری سے پیش کیا۔ ان کی تحریک بہت حد تک کامیاب رہی' جس سے مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور اعتماد بحال بھی ہوگیا۔ لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقۂ کار میں یک رُخاپن تھا۔ اس میں حالات کی تبدیلی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی پالیسی میں استواری اور پایندگی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس میں تبدیلی یا اصلاح کی کوئی گنجایش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی اصلاح اور علاج کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال نے مہیا کی۔ بیشک ان کے خیالات

Marfat.com

بعض ہمعصر مصری اکابر اور دوسرے مفکّرین مثلاً سعید حلیم پاشا، مصطفیٰ کامل پاشا، جمال الدّین افغانی، شیخ محمد عبدہ وغیرہ سے بہت متاثر تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا ماخذ اور منبع قرآنِ کریم اور حدیث و سُنّت تھے۔

افسوس، اس موضوع پر بھی جتنا اور جس انداز سے لکھنے کی ضرورت تھی، نہیں لکھا گیا۔ اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ہمیں الہلال کے اثرات کو متعیّن اور مرتب کرنا چاہیے۔

ترجمان القرآن

دوسرا موضوع ترجمان القرآن کا ہے۔ افسوس کہ یہ تفسیری ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس وقت ہمیں ان اسباب کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں، جو اس کے نامکمل رہ جانے کا باعث ہوئے۔ مولانا مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انھوں نے دو مرتبہ کیا۔ دونوں دفعہ پولیس کی خانہ تلاشی کے نتیجے میں یہ مسوّدے درہم برہم بلکہ تباہ ہو گئے اور انھیں اسے نئے سرے سے تیار کرنا پڑا، جو ہمارے سامنے ہے۔

لیکن میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جن اصحاب نے لکھا ہے کہ مرحوم نے تیسری جلد بھی مکمل کر لی تھی اور اس کا مسوّدہ ضرور کہیں نہ کہیں ان کے کاغذات میں موجود ہوگا، وہ غلطی پر ہیں۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے دو ہفتے قبل جمعہ، ۷ فروری ۱۹۵۸ء صبح کے وقت ہوئی تھی اور یہ اچھی خاصی طویل اور تفصیلی ملاقات تھی۔ اس دن منجملہ اور باتوں کے میں نے ان سے گذارش کی کہ وہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل کر دیں۔ اس پر انھوں نے صراحت سے فرمایا کہ واقعی میری گوناگوں مصروفیتوں کے باعث ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام آج تک معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے، اور میں اس طرف توجہ نہیں کر سکا۔ اب انشاء اللہ جلد ہی میں اسے لکھنا شروع کر دونگا، اور حسبِ معمول (عبدالقیوم) خان صاحب کاتب کو بلوا کے مسوّدہ انھیں دیتا جاؤنگا۔ اس کے ہفتہ بھر بعد وہ غسل خانے سے نکلتے ہوئے پھسل کر گرے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور چند دن بیمار رہ کر وہاں پہنچ گئے جو ہم سب کی منزلِ مقصود ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

Marfat.com

لیکن جو دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ان سے بہت حد تک پورے قرآن کی تفسیر کا اسلوب اور انداز ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے تو جس سرگرمی اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا، وہ حیرتناک تھا۔ میں یہاں صرف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی رائے پر اکتفا کرونگا۔ انھوں نے "معارف" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا تھا۔ لکھتے ہیں :

> ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ بیسیوں ترجمے اور تفسیر کی کتابیں موجود ہوتے ہوئے ترجمان القرآن کو یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے محققوں اور مصنفوں کو ترجمان القرآن پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی زبان، ترجمے کی صحت، استدلال کی جدت اور بیان کی شگفتگی نے اسے ایک تخلیقی کارنامے کا درجہ دے دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے کہ یہ کس حد تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ضروریات کو، فقہ اور مذہب کی موشگافیوں میں جائے بغیر، پورا کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں ترجمان القرآن پر اس پہلو سے ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔

مولانا آزاد تفسیر میں ابن تیمیہ اور ان کے شاگردِ رشید ابن قیمؒ سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے "سلف" کے طریقے کی حمایت میں اور "تفسیر بالرائے" کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن تیمیہ کا بھی یہی اصول تھا۔ ابن تیمیہ اور ابن قیمؒ کی تحریروں اور ترجمان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور واضح کیا جائے کہ کہاں تک مولانا آزاد نے ان کا تتبع کیا۔ اور کس جگہ اور کتنا اس پر اضافہ کیا۔

آزاد بحیثیت ادیب

الہلال کی سب تعریف کرتے ہیں اور بے شک، یہ تعریف کے قابل تھا بھی، اور آج تک ہے۔

Marfat.com

اس کی شکل وصورت، اس کا معیارِ طباعت و تصاویر وغیرہ ہماری صحافت میں بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ آج تک بھی، اِلّا ماشاء اللہ، کوئی پرچہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا۔

اس کی اصلی اہمیت اور کشش اس کی معنوی خوبیاں تھیں۔ مولانا آزاد اور ان کے ہمکاروں نے مضامین کا جو نمونہ پیش کیا، اس سے ملک بھر چونک اُٹھا۔ خود مولانا آزاد کی تحریریں، ان کا موضوع اور دعوتی اندازِ کلام اور اسلوبِ تحریر ایسا بدیہہ تھا کہ الہلال کے قاری مسحور ہو گئے۔

ستم یہ ہے کہ انھوں نے اُردو ادب کو، خاص کر نثر کو، کیا کچھ دیا، یا اُن کا اُردو نثر پہ کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اُردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

آزاد کا نظریۂ تعلیم

مولانا آزاد ۱۹۴۶ء سے اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک بارہ برس، ہندستان کے وزیرِ تعلیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پارلیمنٹ میں، مختلف کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں بیسیوں تقریریں کیں۔ سیکڑوں فائلوں پر مختلف مسائل کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی یہی آرا، ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ جن اصحاب کو حکومتی دفتروں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی محکمے کا وزیر کس حد تک پالیسی کے تعین اور تشکیل میں مؤثر اور معاون ہوتا ہے۔ یقیناً مولانا آزاد بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

میں نے "خطباتِ آزاد" میں ان کی اس نوع کی دو تقریریں شامل کی ہیں (ہندستانی کمیٹی، بہار ۱۹۴۷ء اور عربی نصاب کمیٹی لکھنؤ، فروری ۱۹۴۷ء) افسوس کہ بوجوہ میں آج تک خطبات کی بقیہ جلدیں شائع نہیں کر سکا۔ اور انھوں نے اپنی تقاریر میں اور فائلوں پر جن خیالات کا اظہار فرمایا، اپنی مجبوریوں کے باعث انھیں بھی جمع نہ کر سکا۔ یہ کرنے کا کام ہے اور ضرورت

Marfat.com

ہے کہ کوئی صاحبِ علم ماہرِ تعلیم ان تمام تحریروں کو جمع کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ کام دقت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اس سے ہمیں ان کے نظریۂ تعلیم اور طریقِ کار کے بارے میں روشنی ملیگی۔ اور ممکن ہے کہ ہماری کچھ تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں بھی وہ معاون ثابت ہوں۔

کرنے کے بعض اور کام بھی ہیں۔ لیکن اگر بنیادی طور پر اتنا کچھ بھی ہو جائے، تو بہت حد تک ہم مولانا آزاد کی صحیح تصویر اور ان کی خدمات کا صحیح جائزہ پیش کر کے اپنے آپ سے اور دین و مذہب سے سُرخرو ہو جائینگے۔ انشاء اللہ۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق

Marfat.com

ابوالنّصر غلام یٰسین آہ

دنیا میں کئی ایسے شخص پیدا ہوئے جنھوں نے 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مصداق کم عمری ہی میں غیر معمولی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اگر انھیں موقع ملتا، تو وہ یقیناً ترقی کرتے، علم وفن کے خدمتگذار ثابت ہوتے، بنی نوع انسان کے علم میں اضافہ کرتے، اور ملک وقوم کی نیکنامی ونامور ی کا باعث قرار دیے جاتے۔ لیکن موت نے انھیں فرصت نہ دی؛ ان کا پیمانۂ حیات قبل ازوقت لبریز ہوگیا اور وہ اپنی تمام معنوی خوبیاں ساتھ لیے یہاں سے چل بسے۔

ایسی ہی ایک شخصیت مولانا ابوالنّصر غلام یٰسین آہ کی بھی ہے۔ ان کا نام اتنا مشہور نہیں ہوا جتنا ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام غلام محی الدّین احمد آزاد کا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا عین عنفوانِ شباب میں انتقال ہوگیا، جس سے انھیں اپنی وہبی صلاحیتوں اور اکتسابی قابلیتوں کے اظہار کا پورا موقع نہ ملا۔ وفات کے وقت ان کی عمر یہی ۲۰-۲۱ سال کی رہی ہوگی۔

ان کے والد مولانا محمد خیرالدّین ہندستان سے ہجرت کرکے مکّے میں جا بسے تھے۔[1] انھوں نے

۱- ان کے مفصّل حالات کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی: ۶۶-۱۷۷؛ نیز غبارِ خاطر (حواشی): ۳۰۲

Marfat.com

وہاں پہنچ کر شیخ ابراہیم کُردی المدنی کے خاندان کے نام لیوا ایک عالم شیخ محمد ظاہر وتری مدنی کی بھانجی عالیہ سے شادی کی، جس سے ان کے پانچ اولادیں ہوئیں : تین بیٹیاں : زینب۔ فاطمہ عرف آرزو بیگم اور حنیفہ عرف محمودہ (آبرو بیگم) اور دو بیٹے : ابوالنصر غلام یٰسین اور ابوالکلام غلام محی الدین[۲]۔

مولانا آزاد نے لکھا[۳] ہے کہ میرے بھائی عمر میں مجھ سے دو برس (دوسری جگہ[۴]: دو تین برس) بڑے تھے۔ چونکہ خود مولانا آزاد ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ/ اگست۔ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے[۵]، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام یٰسین کا سالِ ولادت ۱۸۸۵ء/۱۸۸۶ء ہوگا۔

ان کی تعلیم مکّے میں شروع ہوئی۔ وہ چھ سات سال کے ہونگے، جب کہ ان کی بسم اللہ کی رسم حرمِ کعبہ میں شیخ عبداللہ مَرداد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کی حسب ذیل تفصیل مولانا ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں ملتی ہے، جو ان کے قول کے مطابق خود مولانا آزاد کے لفظوں میں ہے۔ لکھتے ہیں[۶] :

> مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جب حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب کرائی گئی اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی، عصر کا وقت تھا اور مرحوم شیخ عبداللہ مرداد سے والد مرحوم نے یہ رسم ادا کرائی تھی۔ انھوں نے مجھ سے تین مرتبہ 'یا فتّاح' کہلوایا اور 'رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ' کہلوایا اور اس کے بعد الف سے شین تک حروف شناخت کرائے .... میٹھے سموسے قاب میں بھرے ہوئے ہمارے ہاں

۲۔ غیر مطبوعہ تحریر : ۲

۳۔ غبارِ خاطر: ۹۸؛ نیز غیر مطبوعہ تحریر : ۲

۴۔ آزاد کی کہانی : ۱۷۸ (دہلی، ۱۹۵۸ء)

۵۔ تذکرہ: ۳۱۰ (ساہتیہ اکادیمی ایڈیشن۔ دہلی، ۱۹۶۸ء)

۶۔ آزاد کی کہانی : ۱۸۷

Marfat.com

سے آئے تھے، جو وہاں تقسیم کیے گئے۔ میں للچائی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھ رہا تھا اور حافظ صاحبؒ انھیں تقسیم کر رہے تھے۔ لیکن شیخ عبداللہ نے اس قاب سے، جو ان کے سامنے پڑی تھی، ایک سموسہ اُٹھا کے مجھے دیا، اور جب میں اسے لینے لگا تو انھوں نے نہیں دیا اور اپنے ہاتھ سے میرے منھ میں رکھ دیا۔ دراصل یہ تقریب بھائی مرحوم کی تھی اور مجھے بھی بٹھلا دیا گیا تھا۔

گویا مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ طفلانہ تفنّن کے طور پر بٹھا دیے گئے تھے، اور ان کی بسم اللہ بھی اسی موقع پر ہوگئی، حال آنکہ ان کی عمر بمشکل پانچ ایک سال کی رہی ہوگی۔ اس کے بعد ان دونوں کی تعلیم گھر پر ہونے لگی۔ بیشتر انھیں ان کی خالہ پڑھاتی تھیں، اگرچہ باہر کے بعض اساتذہ سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انھوں نے تقریباً تین برس میں قرآن ختم کر لیا اور اس کے بعض حصّے مثلاً یٰسٓ، قاف وغیرہ حفظ بھی کر لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عربی صرف و نحو میں اُجرومیہ بن مالک بھی شروع کر دی۔[۷]

۱۸۹۸ء میں ان کے والد مولانا محمد خیرالدّین حجاز سے ہندستان چلے آئے[۹] اور بالآخر انھوں نے یہاں پہنچ کر کلکتے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ان دونوں بھائیوں کی تعلیم درسِ نظامیہ کے نصاب کے مطابق ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی درس میں شامل ہوگئیں۔ یہ تمام تعلیم قدرتی طور پر ان علماء سے حاصل کی گئی، جو عقائد میں ان کے والد مولانا محمد خیرالدّین کے معیار کے مطابق ٹھیک مسلمان تھے۔ یعنی جن اصحاب کو جدید خیالات و تصوّرات کی جنھیں وہ وہابیت کہتے تھے، ہوا تک نہ لگی ہو۔ ابوالنّصر غلام یٰسین نے علوم درسیہ کے علاوہ طب میں بھی اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔

۷۔ اس سے حافظ دل اللہ بنارسی مراد ہیں، جو مولانا خیرالدّین کے قدیم اور معتمد علیہ خادم تھے۔

۸۔ آزاد کی کہانی: ۱۸۸۔ ۱۸۹

۹۔ غیر مطبوعہ تحریر: ۱

Marfat.com

انھوں نے شیخ الرئیس کی قانون کے تینوں مباحث کی تکمیل کی تھی[۱]۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی بھی جانتے تھے، جو انھوں نے ایک ترک طاہر بک سے پڑھی تھی۔

طاہر بک قوم کے ترک تھے اور یمن و شام میں مختلف سرکاری عہدوں پر متمکن رہ چکے تھے۔ قسطنطنیہ میں وہ ایک پرچے "ترجمانِ حقیقت" کے مدیر رہے۔ متعدد زبانیں جانتے تھے؛ فرانسیسی اور فارسی اور عربی بھی اتنی ہی روانی سے بولتے تھے، جتنی اپنی مادری زبان ترکی۔ وہ بڑی پریشان حالی میں پھرتے پھراتے کلکتے پہنچے تھے۔ مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو یہ انھیں مکان پر لے آئے اور والد کی اجازت سے ان سے ترکی پڑھنا شروع کی۔ مولانا آزاد تو تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لیکن آہ پوری مستعدی سے پڑھتے رہے[۱۱]۔

آہ کا گھر کا ماحول سراسر علمی تھا۔ ان کے والد بلاشبہ پرانے رنگ کے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اس پر طریقت کی چاشنی مستزاد۔ ظاہر ہے کہ ان کے ملنے والے بھی یا تو علومِ دین کے ماہر بزرگ ہونگے، یا اصحابِ تصوّف میں سے۔ ایسے گردوپیش میں اولاد کا علم و تعلّم اور تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوجانا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بہت کم عمری ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی طبیعت کا رجحان شروع سے صحافت اور اخبار نویسی کی طرف زیادہ رہا؛ اس کے مقابلے میں غلام یٰسین نے صرف نظم و نثر پر قناعت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کوئی دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بڑے بھائی نے ان سے پیچھے رہنے میں ہیٹی محسوس کی اور آہ تخلص اختیار کیا۔ دونوں داغ کے شاگرد ہوئے۔ آزاد تو جلد ہی انھیں چھوڑ گئے؛ لیکن آہ نے استواری اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور داغ کے انتقال

۱۰۔ آزاد کی کہانی: ۲۰۰

۱۱۔ ایضاً: ۲۳۵-۲۳۶

Marfat.com

تک انھیں کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ داغ کا فروری ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے۔ اس وقت آہ کی عمر بمشکل ۲۰۔۱۹ برس کی ہوگی۔ اس کم عمری میں اور لے دے کے پانچ چھ برس کی شاعری کے باوجود ان کا داغ کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ مولانا احسن مارہروی نے استاد کی زندگی ہی میں ان کے حالات پر مشتمل ایک کتاب 'جلوۂ داغ' کے نام سے شائع کی تھی (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء): یہی ان کی سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔ اس میں انھوں نے داغ کے بیشتر ممتاز شاگردوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس فہرست میں آہ کا نام نہیں ملتا۔ آہ نے اس کتاب سے متعلق ایک تعریفی مضمون احسن الاخبار، کلکتہ میں لکھا تھا: فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا قابل قدر ہدایت نامہ۔ اسی مضمون کے آخر میں انھوں نے احسن مارہروی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے، جو انھوں نے آہ کے نام لکھا تھا۔ احسن لکھتے ہیں[۱۲]:

> مجھ سے جلوۂ داغ میں ایک غلطی ہوگئی ہے، اس کا اعتراف ہے۔ وہ یہ کہ جہاں ممتاز تلامذہ کے نام لکھے ہیں، ان میں آہ کا نام نامی سہواً رہ گیا ہے؛ یہ محض بشریت ہے۔ انشاءاللہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی صحت ہوجائیگی۔

اس پر کسی حاشیے کی ضرورت نہیں۔

نظم کے علاوہ وہ آغاز ہی سے نثر بھی لکھنے لگے تھے۔ چنانچہ اسی احسن الاخبار میں انھوں نے ایک سلسلۂ مضامین 'الخیام' کے عنوان سے لکھا، جو بعد کو اسی نام سے کتابی شکل میں مطبع آصفی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات میں ایک عربی رسالہ 'غبطۃ الناظر' ہے؛ آہ نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترکی زبان کی صرف و نحو بھی اُردو میں قلمبند کی تھی؛ یہ بھی چھپ چکی ہے۔

منشی نوبت رائے نظر نے ۱۸۹۷ء میں ماہنامہ 'خدنگِ نظر' جاری کیا۔ شروع میں یہ محض

۱۲۔ اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام آزاد، از عابد رضا بیدار: ۸۰ (دہلی، ۱۹۶۸ء)

Marfat.com

گلدستہ تھا؛ اس نوع کے دوسرے پرچوں کی مانند اس میں بھی 'طرح' کا اعلان ہوتا اور اس پر شعراء کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد نے نظر کو لکھا کہ اگر آپ اس میں نثری مضامین کا اضافہ کردیں تو میں ان کی ترتیب کا ذمہ لیتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد 'خدنگِ نظر' میں مقالات بھی چھپنے لگے۔ آہ بھی اس رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ ان کا کلامِ نظم و نثر اس کے متعدد شماروں میں ملتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ اس پرچے کی اور کئی طریقوں سے بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً اس کی اشاعت بڑھانے کے لیے خریدار مہیا کرنا، مالی امداد کرنا، وغیرہ۔ جو لوگ پرچے کے خاص ہمدرد اور سرپرست تھے، نظر ان کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدنگِ نظر' کے الفاظ لکھا کرتے تھے[۱۳]۔ متعدد شماروں میں آہ کے نام کے ساتھ 'معاونِ خدنگِ نظر' کے لفظ ملتے ہیں۔ بلکہ اپریل ۱۹۰۰ء کے پرچے میں شکریہ کے عنوان کے تحت ان "معززین اور عالی حوصلہ حضرات کے نامِ نامی" شائع ہوئے ہیں، جنھوں نے 'خدنگِ نظر' کے ہر سہ حصّوں کی خریداری منظور فرما کر پیشگی قیمت عنایت فرمائی"۔۔۔۔ "ایسے حضرات بہت زیادہ شکرگزاری کے مستوجب ہیں، جنھوں نے قیمت مقررّہ سے زیادہ عنایت فرمائی"۔ اسی آخری زمرے میں ایک نام عالی جناب مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی از کلکتہ" کا بھی ہے۔ انھوں نے آٹھ روپے ادا کیے تھے؛ اصلی چندہ صرف تین روپیہ سالانہ تھا۔

دورانِ مطالعہ میں مختلف پرچوں میں ان کے مندرجہ ذیل نثری مضامین میری نظر سے گزرے ہیں:

مشک	مخزن	جون ۱۹۰۲ء
اہلِ ختا کے مذاہب (۱)	مخزن	اکتوبر ۱۹۰۲ء

۱۳۔ مثلاً جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں آہ کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے ناموں کے ساتھ بھی یہ الفاظ ملتے ہیں: (۱) حاجی تجمّل حسین صاحب تجمل جلالپوری؛ (۲) سید مراد حسن صاحب مراد تاجر کتب کلکتہ؛ (۳) حاجی حافظ محمد حسن صاحب نصرت از بمبئی۔ اس کے بعد مئی کے شمارے میں ایک اور صاحب حسن علی صاحب بن شجاع الدین صاحب سوداگر بمبئی کے نام کے ساتھ یہی لفظ لکھتے ہیں۔

Marfat.com

اہلِ ختا کے مذاہب (۲)	مخزن	فروری ۱۹۰۳ء
قطراتِ موسیقی (علیہ شفیقہ کے ترکی مضمون کا اردو ترجمہ)	خاتون	جنوری ۱۹۰۶ء
تحریر (۱)	خدنگِ نظر	اپریل ۱۹۰۲ء
تحریر (۲)	خدنگِ نظر	جولائی ۱۹۰۲ء
عالمِ اجسام (۱)	خدنگِ نظر	اگست ۱۹۰۲ء
عالمِ اجسام (۲)	خدنگِ نظر	ستمبر ۱۹۰۲ء
حیوانات کی تعجب خیز پرستش: مصر کا مشہور دیوتا آمون	خدنگِ نظر	دسمبر ۱۹۰۲ء
مشہور رومی فصیح: سسرو (۱)	خدنگِ نظر	دسمبر ۱۹۰۲ء
مشہور رومی فصیح: سسرو (۲)	خدنگِ نظر	جنوری ۱۹۰۳ء
عالمِ اجسام (۳)	خدنگِ نظر	فروری ۱۹۰۳ء
فلسفہ	خدنگِ نظر	مارچ ۱۹۰۳ء
عالمِ اجسام (۴)	خدنگِ نظر	اپریل ۱۹۰۳ء
قدیم مصریوں کے رسومِ تجہیز و تکفین	خدنگِ نظر	جون ۱۹۰۳ء
عربوں کی بت پرستی	خدنگِ نظر	جولائی ۱۹۰۳ء
شادی (اسراف کے خلاف)	لسان الصدق (۱:۲)	۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء
توہمات کی زندگی	لسان الصدق (۲:۱)	۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء
اردو کا دکھڑا اور بنگالہ	ایضاً (۲:۳)	مارچ ۱۹۰۴ء
شگون	ایضا	
سادہ لوحی	ایضاً	مئی ۱۹۰۴ء
ڈی ماس تھینیز: یونان کا ایک فاتح لکچرر (ترجمہ از انگریزی)	ایضاً (۳: ۱-۲)	اپریل-مئی ۱۹۰۵ء

Marfat.com

کانشنس یعنی ایمانی قوت
قبروں پر پھول چڑھانا } مضامین مرقع عالم
(بحوالہ "ہماری زبان" ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۴)

مولانا آزاد اور آہ اپریل ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔ دونوں نے اس موقع پر تقریریں بھی کی تھیں۔ آہ کی تقریر انجمن کی سالانہ رُوداد میں موجود ہے۔ وصل بلگرامی کے تعزیتی شذرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آہ انجمن کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۵ء میں بھی شامل ہوئے تھے اور انھوں نے اس موقع پر بھی تقریر کی تھی۔

آہ کو اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے؛ جو اتفاق سے جلد میسر آ گیا۔ ایک صاحب تھے حافظ عبدالرحمن امرتسری؛ انھوں نے اسلامی ملکوں کے بہت چکر کاٹے تھے، اسی باعث اپنے نام کے ساتھ "سیاحِ ممالکِ اسلامیہ" لکھا کرتے تھے؛ ان کا سفرنامہ چھپ چکا ہے، آہ کی کہیں ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی دلچسپ باتوں نے گویا سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ دونوں نے عراق اور مغربی ایشیا کے مختلف ممالک کی سیر کا منصوبہ بنایا۔ مولانا آزاد بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب یہ قافلہ بغداد پہنچا، تو مولانا آزاد سخت بیمار پڑ گئے۔ چونکہ ایسی حالت میں ان کا سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا، یہ بغداد سے ہندستان واپس چلے آئے۔ آہ اور حافظ عبدالرحمن آگے بڑھ گئے اور موصل، دیارِ بکر سے ہوتے ہوئے شام و لبنان پہنچے۔ اس سال ان نواح میں سخت برفباری ہوئی تھی، اور سردی بہت شدید تھی۔ ہندستانی مزاج کو ایسا موسم کمتر ہی راس آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ یہی تکلیف آگے چل کر موت کا بہانہ بن گئی۔ مولانا آزاد کا خیال ہے کہ ان کے ہمسفر حافظ عبدالرحمن نے کوئی خاص حقِ رفاقت ادا نہ کیا اور ان کی دیکھ بھال میں کوتاہی کا ثبوت دیا۔[۱۴] رفتہ رفتہ آہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ بلادِ شام سے واپس بغداد آئے۔ یہاں اس زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم انگریزی قونصل خانے میں بحیثیت معاون ملازم تھے۔ انھوں نے ہر طرح سے مدد کی۔ جب مولانا خیرالدین کو

۱۴- آزاد کی کہانی : ۱۶۹

Marfat.com

بمبئی میں بیٹے کی بیماری کی خبر ملی، تو انھوں نے یہاں سے روپیہ بھجوادیا اور یہ واپس وطن آئے، لیکن کس حالت میں کہ تندرستی بالکل تباہ ہوچکی تھی۔ والد انھیں لے کر کلکتے پہنچے۔ علاج معالجے کے باوجود کچھ افاقہ نہ ہوا اور بالآخر ان کا نمونیہ (ذات الجنب) سے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوگیا[۱۵]۔ قبرستان مانک تلہ میں اپنی خاندانی ہڑواڑہی میں دفن ہوئے۔

مولانا خیرالدّین کو جواں سال بیٹے کی موت سے جو صدمہ ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آہ اپنے والد کے بہت چہیتے فرزند تھے۔ مولانا آزاد بہت ابتداہی میں سرسیّد کی تحریروں کے مطالعے کے بعد اپنے موروثی عقائد سے بغاوت کرچکے تھے۔ مولانا خیرالدّین پیری مریدی کے قائل اور بہت قدامت پرست تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ میرے بعد یہ سلسلہ آزاد تو چلانے سے رہے، اس لیے انھوں نے اپنی خاص تصوّف کی تعلیم اور توجہ کے لیے آہ کو چُنا۔ آہ بھی امتحان میں پورے اُترے۔ وہ بڑے راسخ الاعتقاد اور اپنے خاندانی عقائد اعمال میں بہت پختہ تھے اور ہر بات میں والد کے نقشِ قدم پر تھے۔ انھیں کی طرح سے وعظ کہتے اور اپنے لب ولہجہ اور حرکات وسکنات میں پوری طرح ان کی تقلید کرتے تھے۔ آہ کا لباس، چال ڈھال، وعظ کہنے کا طریقہ اس حد تک اپنے والد سے ملتا جلتا تھا کہ جن لوگوں نے مولانا خیرالدّین کے وعظ سُنے تھے، وہ اعتراف کرتے تھے کہ آہ کے وعظوں میں بھی وہی لطف آتا ہے:

آہ کی وفات پر مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے رسالے عالمگیر (اکتوبر ۱۹۰۶ء) میں یہ تفصیلی شذرہ لکھا تھا:[۱۶]

> مولوی ابوالنّصر غلام یٰسین آہ دہلوی مرحوم نہایت ہی لائق مضمون نویس اور عمدہ شاعر تھے۔ آپ کا کلام اکثر خدنگِ نظر اور دیگر علمی رسالوں میں

۱۵۔ ایضاً : ۱۴۵

۱۶۔ ابوالکلام آزاد (بیدار) : ۴۲-۴۳

Marfat.com

شائع ہوتا رہا ہے۔ نثر کے مضامین، کوئی ایسا اُردو اخبار اور رسالہ نہ تھا جس میں نہ نکلتے رہے ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں خاکسار سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس جلسہ میں آپ نے جو لکچر دیے اور نظمیں پڑھیں، ان کا ایک ایک لفظ آپ کی اعلیٰ لیاقت اور جدّت پسند طبیعت کا شاہد تھا۔ حاضرین و سامعین سُن سُن کر نعرہ آفریں بلند کر رہے تھے۔ حال میں آپ اسلامی ممالک کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں سے آتے ہی آپ نے انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہمیں آپ کی ناگہانی اور بیوقت موت کا افسوس اور سخت افسوس ہے، ایسا ہونہار اور علمی مذاق کا دلدادہ کہاں سے لائینگے! خدا آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کے اعزّہ کو صبرِ جمیل۔ یقین ہے کہ آپ نے اپنے سفرنامے کا مسوّدہ ضرور چھوڑا ہوگا۔ امید ہے کہ آپ کے چھوٹے بھائی مکرّمی حضرت ابوالکلام آزاد دہلوی جو مشہور انشا پرداز ہیں آپ کا سفرنامہ آپ کی سوانحعمری اور کلام و مضمون ضرور ایک جگہ ترتیب دے کر شائع کرینگے اور ان کی مختصر سرگذشت سے ہمیں آگاہ کرینگے۔

آہ نے غالباً سفرنامہ تو نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنے سفر کے دوران میں ہفتہ وار وطن، لاہور کو مراسلات بھیجتے رہے تھے۔ ان خطوط میں ان کے سفر کے کوائف اور بہت دلچسپ معلومات ہیں۔

آہ کا بہت کم عمری میں نکاح ہوگیا تھا۔ ان کے والد کے ایک بہت مخلص مرید آفتاب الدین صاحب تھے۔ وہ مدۃ العمر کلکتے میں سروے کے محکمے میں ملازم رہے اور یہیں سے انھوں نے پنشن پائی۔ ان کے پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو آہ اور آزاد کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ آہ کے ان سے ایک صاحبزادہ نورالدین احمد پیدا ہوا۔ یہ بفضلہ اب بھی حیات ہیں، کلکتے میں قیام ہے۔

Marfat.com

آہ نے بہت کم عمر پائی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے وقت وہ ۲۰-۲۱ برس سے زیادہ کے نہیں ہونگے۔ ان کی شاعری کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، لے دے کے یہی چھ سات برس کی۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں نے انھیں اس قابل خیال کیا کہ ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ مطالعے کے دوران میں مجھے ان کے دو شاگردوں کے نام ملے ہیں: اوّل ہنشی سلیم خان سلیم مولود خوان (بمبئی) اور دوسرے شیخ احمد جنیری واہ رئیس بمبئی۔

مولانا آزاد کہتے ہیں[۱۷] کہ آہ کا دیوان تقریباً مکمل ہوچکا تھا جس میں ہر صنف کا معتدبہ کلام تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد تلاش کروایا، تو نہیں ملا، دورانِ مطالعہ میں مجھے جو کچھ دستیاب ہوا، وہ یہاں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اور بھی بہت ہوگا، جو میری نظر سے رہ گیا۔

۱۷۔ آزاد کی کہانی: ۱۸۰

Marfat.com

غزلیات

اشکِ حسرت ہیں ترے ہجر میں ڈھلنے کے لیے
ایک دریا مری آنکھوں میں اُبلنے کے لیے

کوئی تدبیر نہیں دم کے نکلنے کے لیے
کیا اُٹھا رکھتے ہیں بیمار سنبھلنے کے لیے

چاہیے صورتِ پروانہ دلِ سوز طلب
ایک پر ایک گرا پڑتا ہے جلنے کے لیے

داغ کیوں تم نے دیا اہل کے رقیبوں سے مجھے
آتشِ ہجر نہ کم تھی مرے جلنے کے لیے

لے گئے ہو جو مرے ہوش و خرد، صبر و قرار
داغ دے جاؤ کوئی دل کے بہلنے کے لیے

نزع میں دیکھے کوئی حسرت و ارماں کا ہجوم
سب مرے ساتھ ہی تیار ہیں چلنے کے لیے

آبلے دل میں پڑے داغِ جگر کے ہمراہ
کیا بہار آئی مری پھولنے پھلنے کے لیے

جان ہی عشق کی افتاد نے لے لی آخر
ایک ٹھوکر بھی کھائی تھی سنبھلنے کے لیے

دو پہر حسن کی اب ہو چکی، اے مستِ شباب!
سر پہ آیا ہے دو پٹہ ترا ڈھلنے کے لیے

دیکھ یوں چاہتے ہیں چاہنے والے تجھ کو
ہر طرف آنکھیں بچھی ہیں ترے چلنے کے لیے

جب بگڑتے ہیں، سنبھالے سے سنبھلتے ہی نہیں
آپ بھی میری طبیعت ہیں مچلنے کے لیے

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہے کیوں پیرِ مغاں
مے ہے ڈھلنے کے لیے، جام ہیں چلنے کے لیے

سیکھ لے مجھ سے کوئی مشغلۂ تنہائی
تیری تصویر سے باتیں ہیں بہلنے کے لیے

لڑکھڑاتے ہیں کبھی رند، تو دیکھ، اے زاہد!
یا علی! منہ سے نکلتا ہے سنبھلنے کے لیے

کھائینگے زہر حسینانِ جہاں آج اُن پر
دھانی پوشاک منگاتے ہیں بدلنے کے لیے

مجمعِ حسرت و اندوہ سے دم گھٹتا ہے
راہ پاتے نہیں ارمان نکلنے کے لیے

تم سلامت ہو، تو آئے گی قیامت بھی کہیں
اک یہی چال اُٹھا رکھی ہے چلنے کے لیے

Marfat.com

لوٹ جاؤ دلِ بیتاب ہمارا لے کر کوئی حیلہ نہیں درکار مچلنے کے لیے
ہے مرے خانۂ تاریک میں یکساں شب و روز اِک چراغ آٹھ پہر چاہیے جلنے کے لیے
شاعری داد طلب، داد نہ دے جب کوئی، آہ!
پھر تو اک شغل ہے یہ دل کے بہلنے کے لیے

(نیرنگِ عالم، اپریل ۱۸۹۹ء)

۲

طالعِ بد سے نہ آئی راست اک تدبیر بھی
تو پھرا کیا ہم سے ظالم! پھر گئی تقدیر بھی
دل میں لازم ہے خیالِ رُوے پُرتنویر بھی
چاہیے اِس آئینے کو نور کی تصویر بھی
مستعد ہے جان دینے کو دلِ نخچیر بھی
ناوک افگن، پاس تیرے ہے کماں بھی، تیر بھی
سُوے زنداں جب ترا دیوانۂ گیسو چلا
پاؤں پڑنے کے لیے آگے بڑھی زنجیر بھی
خاک میں ملنا ہے تجکو، خاک کا پُتلا ہے تو
خاک ہے مُنعم، یہ سازِ عیش بھی، تعمیر بھی
جم گیا نقشہ رقیبوں کا دلِ دلدار پر
ہوگئی بیکار اب تحریر بھی، تقریر بھی
سر میں سودا زُلف کا ہے، ابروؤں کی دل میں یاد
جان کے پیچھے پڑا ہے طوق بھی، زنجیر بھی
آپ آئے خانۂ دل میں، تو روشن ہوگیا
اب چمک اُٹھے، خدا چاہے، مری تقدیر بھی

Marfat.com

بسملِ نوکِ مژہ ہوں، کشتۂ ابروئے یار
ساتھ میرے ہو لحد میں، تیر بھی، شمشیر بھی
کمسنی میں چاہتے ہو تم اگر مشقِ جفا
ترچھی چتون سے ذرا سیکھو لگانا تیر بھی
حالِ زخمیِ محبت سے کسے صدمہ نہیں
خم کیے ہے سر کو، اے قاتل! تری شمشیر بھی
روح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
سحر ہے، ظالم! تری جادو بھری تقریر بھی
آہ! اس سفاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
"روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہگیر بھی"[۵]

(خدنگِ نظر، جنوری، ۱۹۰۰ء)

(۳)

کبھی اُو ستمگار! وعدہ وفا کر — مریضِ تپِ ہجر کی کچھ دوا کر
رقیبوں سے ہنستے ہو باتیں بنا کر — مری جان لینا ہے تم کو رُلا کر
تپِ عشق کی آگ بھڑکی ہوئی ہے — مجھے بھی جلائیگی، دل کو جلا کر
شکایت یہ ہے دستِ قدرت سے ہم کو — بگاڑا تمھیں خوبصورت بنا کر
تجلّی پہ ہو جائیں مائل نہ موسیٰ — وہ بیٹھے ہیں پردے میں کیوں منہ چھپا کر
ہوا بُوئے مے لائی کیا میکدے سے — گرے شیخ سجدے میں کیوں لڑکھڑا کر
ہنسیں، بولیں میت پہ آکر ہماری — وہ بیٹھے ہیں کیوں زنی صورت بنا کر
ہزاروں ہی وعدے ہیں، لاکھوں ہی پیماں — بہت سے نہیں، ایک ہی دو وفا کر

---

۵ یہ مصرع طرح تھا۔

Marfat.com

ترقی پہ ہے بیوفائی کسی کی — ابھی اور اے زندگی! کچھ وفا کر
قیامت کا غصہ، غضب کے ہیں تیور — مری جان لیتے ہو، آنکھیں دکھا کر
زمانے کی نیرنگیاں کوئی دیکھے — بگاڑے بہت خوبصورت بنا کر

مرا دردِ پنہاں، مرے دل کی حسرت
وہ پوچھے کبھی آہ! مجھ کو بلا کر

(خدنگِ نظر، فروری، ۱۹۰۰ء)

(۴)

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں — کہتے ہیں ناز سے وہ: خدا کی قسم نہیں
تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں — جینے کا اپنے رنج ہے، مرنے کا غم نہیں
تکتے ہیں گاہ مجھکو، کبھی وہ رقیب کو — شوخی سے شرم، شرم سے شوخی بھی کم نہیں
اِک میں کہ جان دیتا ہوں کس ذوق و شوق سے — اک تو کہ مرے مرنے کا کچھ بھی الم نہیں
دل کی تڑپ میں شوخیِ جاناں کا ہے مزہ — اب آرزوے وصل، خدا کی قسم نہیں
آئی صدا مری لحدِ پایمال سے — رفتارِ یار فتنۂ محشر سے کم نہیں
ملتے ہی آنکھ، دل مرا چورنگ ہوگیا — ترچھی نظر حضور کی، برچھی سے کم نہیں
کھنچ جانا بات بات پہ ان کا شبِ وصال — میرے لیے تو خنجرِ بُرّاں سے کم نہیں
تم ہو زباں دراز، تو ہم بیزبان ہیں — تم ہم سے کم نہیں ہو، تو ہم تم سے کم نہیں
جب سے کہ خطِ سبز کا نظارہ ہوگیا — ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، آپے میں ہم نہیں

عاشق نہ ہو دہان و کمر کا جو اس کی، آہ!
کچھ وہ مسافرِ رہِ ملکِ عدم نہیں

(خدنگِ نظر، فروری ۱۹۰۰ء)

Marfat.com

(۵)

بس کرو اب رونے والے رو چکے "رات گذری، سونے والے سو چکے"
آپ کی چتون پہ عاشق ہو چکے جان اپنی رونے والے کھو چکے
اب تو سیدھی کیجیے ترچھی نگاہ سیکڑوں ٹکڑے جگر کے ہو چکے
کچھ نئی حجت ہے، میری آپ کی حشر تک ممکن نہیں، جو ہو چکے
آبرو پائی نگاہِ خلق میں ہم شہیدِ تیغِ ابرو ہو چکے
یہ بھی وعدہ آپ کا ہم دیکھ لیں آج ہی کل میں قیامت ہو چکے
آرزو یوں بھی نہ نکلی وصل کی ہم کنارِ قبر میں بھی سو چکے
سادہ کاغذ رہ گیا، اے نامہ بر! خط کو ہم اشکوں سے اپنے دھو چکے
خالِ روے یار کے عاشق ہیں ہم کشتِ دل میں تخمِ حسرت بو چکے
کیا دہن ہے، کیا کمر ہے آپ کی دیکھتے ہی جان و دل گم ہو چکے
ہنس رہے ہیں باغ میں غیروں کے ساتھ میرے پھولوں میں وہ آکر رو چکے
کوے جاناں میں عجب اندھیر ہے نقدِ دل ہم بھی اُسی جا کھو چکے
بڑھ کے ہے عارض تمھارا یا قمر بخت یہ، رُخ سے نقاب اُلٹو چکے

نخلِ غم پھولے پھلیگا خلق میں
آہ! ہم تخمِ محبت بو چکے

(خدنگِ نظر، مارچ، ۱۵ء)

(۶)

کشتۂ حسرتِ ازل سے ہے دلِ ناکامِ عشق
روح نے پہلے پہل آکر دیا پیغامِ عشق

---

۵ مصرعِ طرح

Marfat.com

آبلوں کا گنجِ گوہر دے کے صحرا نے کہا:
سالکِ وحشت کو ملتا ہے یہی انعامِ عشق

فاتحہ پڑھنے جو آئے ہیں ہماری قبر پر
دوستوں کو آج آتا ہے نظر انجامِ عشق

آبلہ دل کا نہ ٹوٹا حشر تک، اے چارہ گر!
عالمِ فانی میں ہے کس درجہ استحکامِ عشق

اب نہ وہ جوشِ جوانی ہے، نہ داغوں کی بہار
صبحِ پیری آئی بجھتے ہیں چراغِ شامِ عشق

ہائے، وہ آنسو بہانا ان کا میری لاش پر
اور وہ کہنا کہ ہوتا ہے یہی انجامِ عشق

سہتے سہتے رنج و غم آخر نتیجہ یہ ہوا
"جان دے کر کام اپنا کر گئے ناکامِ عشق"

اب رسائی خلوتِ محبوب تک آسان ہے
دل نے آہوں کو بنایا ہے کمندِ بامِ عشق

بٹ رہے ہیں جامِ الفت حُسن کی خیرات میں
دوست دشمن پر ہے یکساں آج فیضِ عامِ عشق

جو تڑپنے میں مزا ملتا ہے ظالم! کیا کہوں
میرے دل سے کوئی پوچھے لذتِ آلامِ عشق

زہر کھا کر مر گیا اُس سبزہ رو کے عشق میں
آہ نے پایا ہے ملبوسِ زمرّد فامِ عشق

(خدنگِ نظر، اپریل، ۱۹۰۰ء)

سہ مصرع طرح

Marfat.com

(۷)

مصحفِ رُخسار سے ہوتا ہے ہمسر آئینہ
کس قدر گستاخ ہے، اللہ اکبر آئینہ

نامۂ آئینہ رُو ہے اے کبوتر! آئینہ
تو تو اپنے ساتھ لایا ہے اُڑا کر آئینہ

پہلے دل پر ہاتھ رکھ لیجے کہ آجائے نہ غش
"اپنی صورت دیکھیے گا پھر اُٹھا کر آئینہ"ؔ

لے چلا ہے اس کے رُوئے صاف و روشن کا خیال
راہِ الفت میں ہوا ہے اپنا رہبر آئینہ

رُو برو کی چوٹ ہے، وہ بھی بڑا بیباک ہے
دیکھیے صاحب! دم تزیں سنبھل کر آئینہ

موجزن اک نور کا دریا نظر آیا مجھے
آ گیا جس وقت اُس رُخ کے برابر آئینہ

اب نہ چاہیں گے تمھیں لے ہوشانِ خود پسند
ہم نے رکھا طاقِ نسیاں پر اُٹھا کر آئینہ

آئینہ میں ابروئے خمدار اُو قاتل! نہ دیکھ
ذبح کرتا ہے تجھے بن بن کے خنجر آئینہ

روئے تاباں دیکھتے ہی آگ دل میں لگ گئی
شان اُس کی، بن گیا سینے میں مجمر آئینہ

عکس سے بھی اپنے آتی ہے انھیں شرم و حیا
دیکھتے ہیں صبح وصل آنکھیں بچرا کر آئینہ

ؔ مصرع طرح

Marfat.com

پرتوِ روئے کتابی نے دیا مصحف کا کام
اللہ اللہ ہوگیا گویا پیمبر آئینہ

(خدنگِ نظر، جولائی ۱۹۰۰ء)

(۸)

جب سے دل میں اس حسیں کی یاد ہے — گُور پیکر شعلۂ فریاد ہے
ایک ہے مسرور، اک ناشاد ہے — بزمِ ہستی کی عجب رُوداد ہے
تم کو چاہا سب کی نظروں سے گرے — یہ ہمارے عشق کی افتاد ہے
قید میں جلتا نہیں بلبل کا دل — یہ چراغِ خانۂ صیاد ہے
ناز ہم سے اور غیروں سے نیاز — مہرباں! یہ آپ کا ایجاد ہے
ایک عالم کی اُڑائی اُس نے نیند — اب مری فریاد کی فریاد ہے
زندگی میں تھیں ہزاروں گردشیں — مر کے بھی مٹّی مری برباد ہے
ہوگئی برباد اپنی خاک بھی — وہ ابھی تک برسرِ بیداد ہے
لطف کے پردے میں ظلم و جَور ہیں — کس ستم کا وہ ستم ایجاد ہے
بن پڑے تو ہم بھی دیں حُوروں کو دل — دشمنِ جاں، حسنِ آدمزاد ہے
خاک کر دے آسماں کو تو سہی — دوسری بجلی مری فریاد ہے
ہجر کی شب دیکھیے کیونکر کٹے — ہر ستارہ دیدۂ جلّاد ہے

جس کو سب کہتے ہیں آہِ نیمجاں
یہ وہی تو خانماں برباد ہے٭

(خدنگِ نظر، ستمبر ۱۹۰۰ء)

٭ مصرع طرح: مبتلائے غم دلِ ناشاد ہے۔

Marfat.com

(۹)

شرم کیسی یہ شبِ وصل! ادھر آؤ بھی — دیکھتا کون ہے، چپکے سے لپٹ جاؤ بھی
کیسے بیدرد ہو، سفاک ہو تم، جاؤ بھی — "آپ ہی ظلم کرو، آپ ہی پچھتاؤ بھی"
پردے آنکھوں پہ پڑے ہیں کہ بہار آئی ہے — ہو چکی توبہ، بس اب ساغرِ مے لاؤ بھی
تم تو جانے ہی پہ تیار ہو صبحِ شبِ وصل — کچھ ہمارے دلِ بیتاب کو سمجھاؤ بھی
ہم نے مانا کہ غش آجائیگا موسیٰ کی طرح — تم کو کیا فکر ہے، صورت ہمیں دکھلاؤ بھی
یا تو اپنے نہیں اُٹھتے طرفِ منزلِ عشق — دل بڑھا جاتا ہے، یہ کہتا ہوا: آؤ بھی
دیکھ کر دل کی تڑپ، آپ ہی ڈر بھی جاؤ — اور بجلی کی طرح، آپ ہی تڑپاؤ بھی
بات ہی وعدہ خلافی نے تمھاری کھو دی — روز کہتے ہو: ہم آئینگے؛ اجی، جاؤ بھی

آہ کے دل کا بھی دھو جائے پسِ مرگ غبار
چند آنسو کبھی تربت پہ بہا جاؤ بھی

(خدنگِ نظر، اکتوبر ۱۹۰۰ء)

(۱۰)

سرِ قبر ٹھوکر لگاتے ہوئے — چلو، سوتی قسمت جگاتے ہوئے
اِدھر دیکھا ظالم کو آتے ہوئے — اُدھر دل کو پہلو سے جاتے ہوئے
چلے اُٹھ کے تیوری چڑھاتے ہوئے — وہ نظروں سے ہم کو گراتے ہوئے
مری قبر پر آکے کہتے ہیں وہ — بہت نیند کے آپ ماتے ہوئے
حیا ہے جو مانع، تو آتی ہے شرم — تصور میں بھی ان کو آتے ہوئے
نہ توڑو تو! دل شکستوں کے دل — ڈرو، گھر خدا کا گراتے ہوئے

ہ مصرع طرح

Marfat.com

کھنچے تیغ کے ساتھ، ابرو ترے ستم پر ستم اور ڈھاتے ہوئے
مجھے دیکھ کر، ہائے، شرما گئے چھپے، ہاتھ سے منہ چھپاتے ہوئے
دکھا کر وہ زلفِ سیہ، چل دیے بلا میرے پیچھے لگاتے ہوئے
خدا جانے کب دل میں آئے، گئے انھیں آتے دیکھا، نہ جاتے ہوئے
گلی سے تری ہم نے دیکھا ہے حور! ہوا باغِ جنت کی آتے ہوئے
تمنائے دل کو ترے خوف سے زبان تک بھی ڈرتے ہیں لاتے ہوئے

گھلے جاتے ہیں آہ! ہم عشق میں
اثر آہ کا آزماتے ہوئے[1]

(خدنگِ نظر، نومبر ۱۹۰۰ء)

(۱۱)

ظاہری صاحب سلامت اور ہے اور راہ و رسم و الفت اور ہے
تھا لڑکپن قہر، اب آیا شباب یہ قیامت پر قیامت اور ہے
حاجتِ طوق و سلاسل کچھ نہیں عاشقِ گیسو کی وحشت اور ہے
بیوفا ہیں سارے عالم کے حسین ان کی صورت اور، سیرت اور ہے
ظلم ہیں ان کے غضب کا ہے مزہ اس لیے دل کو محبت اور ہے
سامنے وہ، اور ہیں نظروں سے دور یار آئینے کی قسمت اور ہے
ہم سے کیا محشر میں ہوگی باز پرس شیخ! اس کی شانِ رحمت اور ہے
گرمیِ داغِ دلِ سوزاں ہے اور حدتِ مہرِ قیامت اور ہے
قتل کر کے لاش بھی کر پامال "ایک نکلی، ایک حسرت اور ہے"[2]

---

[1] مصرع طرح تھا: جھجکتے ہو کیوں دل میں آتے ہوئے
[2] مصرع طرح

Marfat.com

درد کی دل میں کھٹک پہلے سے تھی — آپ کا جانا قیامت اور ہے
خاک تک تو کر چکے برباد تم — اب بھی کیا دل میں کدورت اور ہے؟
ہم شبِ فرقت میں مر مر کر جیے — کیا کوئی باقی قیامت اور ہے

کیا کہوں میں حالِ آہِ دھلوی
ان دنوں رنگِ طبیعت اور ہے

(خدنگِ نظر، دسمبر ۱۹۰۰ء)

(۱۲)

کبھی وہ جان کا دشمن، وہ قاتل یاد آتا ہے
کبھی پہلوے خالی دیکھ کر دل یاد آتا ہے

چلے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے ہم دشتِ غربت میں
وطن اپنا ہمیں منزل بمنزل یاد آتا ہے

پھنسے اک اُن سے الفت کر کے ہم دُہری مصیبت میں
اِدھر وہ یاد آتے ہیں، اُدھر دل یاد آتا ہے

رہا پہلو میں جب تک ہم اُسے سمجھا کیے دشمن
گنوا بیٹھے ہیں تو کم بخت اب دل یاد آتا ہے

گزرتا ہے نظر سے جب کوئی پھولا پھلا گلشن
تو پھر دل ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے

مزے کی نیند گو آتی ہے آغازِ جوانی میں
مگر انجام میں یہ وقت، غافل! یاد آتا ہے

کبھی جس دل کو ظالم! دمبدم تو یاد آتا تھا
اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے

ہماری بیگنا ہی پوچھتی رہتی ہے قاتل سے
کبھی تم کو کوئی ناکام بسمل یاد آتا ہے

Marfat.com

بُرا ہوتا ہے صدمہ ہم نشیں کے ہجر کا اے آہ!
کلیجہ کوئی مل دیتا ہے جب دل یاد آتا ہے

(از بغداد : مخزن، جنوری، ۱۹۰۶ء)

(۱۳)

قضا کیوں ہجر میں آتی نہیں، گر آنے والی ہے
کہ اب ٹوٹے ہوئے دل کی نہایت خستہ حالی ہے
اثر کیونکر رہے کچھ دیر ناصح کی نصیحت کا
مزاج اپنا ہے رندانہ، طبیعت لاابالی ہے
مری پھولوں کی محفل میں وہ اپنے دل میں ہنستے ہیں
مگر ظاہر میں صورت رونے والوں کی بنالی ہے
قلق یہ ہے کہ نازک پاؤں دُکھ جائیں نہ قاتل کے
وگرنہ فخر کی جا مجھ کو دل کی پایمالی ہے
بہار اس گلبدن کو ہر روش پر نذر دیتی ہے
دمِ سیرِ چمن ہر شاخِ گل پھولوں کی ڈالی ہے
اگر ساقی اجازت دے، تو اشک سرخ سے بھر دیں
بھرے بیٹھے ہیں ہم محفل میں جب سے جام خالی ہے
غضب کا ہے، قیامت کا ہے، یہ چلتا ہوا جادو
کیا دیوانہ اُس کو تم نے جس پر آنکھ ڈالی ہے
اگر چاہا خدا نے، گھر کریں گے غیر کے دل میں
نئی اِک راہ ہم نے اُن سے ملنے کی نکالی ہے
یہ کس نے اپنے پیارے ناخنوں سے چٹکیاں لی ہیں
کہ دل میں جو نشانِ زخم باقی ہے، ہلالی ہے

Marfat.com

بنی ہے مدتوں میں یوں شہیدِ ناز کی تربت
کہ ہر قاتل نے چٹکی چٹکی اس پر خاک ڈالی ہے
جلا رکھو چراغ، اے آہ! دن سے اپنے گھر میں تم
اندھیرا ہو چلا، شامِ جدائی آنے والی ہے

(مخزن، فروری، ۱۹۰۶ء)

(۱۴)

کیا کہوں خنجر اُٹھایا اس نے کس انداز سے
مرنے والا قتل سے پہلے ہی بسمل ہو گیا

(۱۵)

چارہ گر چپکے سے کیا پڑھ کے دوا دیتے ہیں
کوستے ہیں مجھے ظالم کہ دعا دیتے ہیں
ہم فقیروں کو بھی کچھ حُسن کی خیرات ملے
جن کو دیتا ہے خدا، راہِ خدا دیتے ہیں
کیوں کروں میں خلشِ خارِ تمنا کا علاج
یہ کھٹکتے ہوئے کانٹے تو مزا دیتے ہیں

(خمخانۂ جاوید، ۱: ۱۱۴)

Marfat.com

تضمین

ایک نظم بعنوان "انجمن" مخزن اگست ۱۹۰۲ء میں ادارے کے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے:

> کلکتے کی ایک علمی انجمن میں مشارکت کے لیے لوگوں کو ترغیب دینے کے واسطے مندرجۂ ذیل چند بند مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی مقیم کلکتہ نے ایک جلسہ میں پڑھے ہیں۔ اور اب بہ نظرِ اشاعت دفترِ مخزن میں ارسال فرمائے ہیں اور ساتھ ہی چند تمہیدی سطریں لکھتے ہیں:
>
> ملک الشّعراء ناصر بخاری کی غزل پر یہ اردو کے بند کہے گئے ہیں۔ یہ وہی ناصر بخاری ہے جس نے مکّہ شریف جاتے ہوئے بغداد میں چند روز قیام کیا اور وہاں کے شاہی استاد خواجہ سلمان کو اپنے گروہِ تلامیذہ میں داخل کیا۔ یہاں اختصاراً بیان کیا جاتا ہے اُس کی حالتِ افلاس اس قابل نہ تھی کہ خواجہ سلمان جیسے کے گھر پر ملاقات کی غرض سے جاتا۔ اتفاقاً ایک دن دریائے دجلہ کی سیر کو خواجہ صاحب مع معزّزانِ شہر و شاگردانِ مشتاق تشریف لائے۔ آپس میں بڑی دیر سے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اب کے سال (کچھ دنوں پہلے) دجلہ بڑے زور و شور پر تھا

Marfat.com

اور خوب چڑھ آیا تھا۔ ناصر نے ان کے یہاں آنے کی خبر سُن پائی۔ اپنی اسی خستہ سالی کا تحفہ لیے ہوئے جا پہنچا اور موقع پاکر سلام کیا۔ خواجہ صاحب نے کہا "چہ کسی" ناصر نے جواب دیا کہ "مردِ غریب شاعرم"۔ اسی اثنا میں خواجہ سلمان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا ؎

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانہ بود

پھر کر جو شاگردوں کی سمت نظر اُٹھائی، سب کو سرنگوں پایا۔ کسی نے ثانی مصرع نہیں کہا۔ سب کے سب تفکر کے دریا میں غوطہ کھانے لگے۔ مایوسی کے عالم میں (بطور امتحان) سلمان نے ناصر سے کہا

ار تو شاعر ہستی، مصرعہ ثانیش بگو

ناصر نے کچھ آگے بڑھ کر کہا "بچشم" ؎

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانہ بود

پائے در زنجیر و کف برلب، مگر دیوانہ بود

خواجہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ دوڑ کے معانقہ کیا۔ نام پوچھا اور بعد تعریف و ستایش سیدھے گھر لے آئے اور بڑی عزت کی۔ اس کا شہرہ تو سنا ہی ہوا تھا اب عین الیقین کا رتبہ حاصل کرتے ہی اپنے کلام پر اصلاح لی اور ناصر بخاری کی شاگردی کا فخر پایا۔ ناصر نے اسی وقت یہ پانچ شعر کی غزل کہی تھی جو بغداد میں عام زبان زد ہوگئی تھی اور جسے بغداد والے ہر کہ دمہ کی زبان پر پاتے تھے۔"

نظم "انجمن" ملاحظہ کیجیے:

اجمال کی تفصیل ہے، اور بات بے ایسی
اوروں سے تو مطلب نہیں، میں کہتا ہوں اپنی
زورِ کششِ سلسلۂ الفتِ جاناں
کھینچے لیے جاتا ہے مجھے سوئے گلستاں

Marfat.com

پھولوں سے سرورکار، نہ کانٹوں سے عداوت
گلچیں سے نہ اَن بَن ہے، نہ بلبل سے محبّت
"مارا ہوسِ صحبت جاں پرورِ یار است"
"ورنہ غرض از بادہ پرستی نہ خمار است"

دو چار اکٹھے ہوں اگر بات کے پورے
پورے ہوں، کبھی کام نہ رہ جائیں ادھورے
ہمت کی طرح چاہ کے انداز فسوں ہوں
رکھتے ہی قدم بزم میں سرگرمِ جنوں ہوں
جو عشق کے بندے ہیں، وہ غم کھائیں تو کھائیں
جو مرد ہیں میداں میں، وہی آئیں تو آئیں
"آتش نفساں قیمتِ میخانہ شناسند"
"افسردہ دلاں را بخرابات چہ کار است"

مشتاق ہیں، مشتاق ہیں، صورت تو دکھاؤ
مطلب کی کہو، آؤ، ذرا ہاتھ ملاؤ
مل بیٹھ کے دس پانچ کرو کام کی باتیں
کٹ جائیں کبھی مسئلۂ عشق میں راتیں
یاں آؤ، تو معلوم ہو ایمان کی حالت
مل جاؤ تو کثرت ہی بتا دے تمھیں وحدت
"در مدرسہ کس را نہ رسد دعوائے توحید"
"منزل گہِ مردانِ موحّد سرِ دار است"

Marfat.com

تم پہلے تو ملتے نہیں، یہ دیکھ کے نقشؒ
ملتے ہو تو سنتے نہیں، پھر دل کی کہیں کیا
اسلام ہے "اسلام کی بُو باس نہیں ہے
بُو باس ہے، بُو باس کا کچھ پاس نہیں ہے
جب شکل ہی بھونڈی ہے تو انداز سے حاصل
تم روح تو رکھتے نہیں اس ساز سے حاصل!
"تسبیح چہ کار آید و سجادہ چہ باشد!
"بر مرکبِ بے طاقتِ روح' ایں ہمہ باراست"

اپنوں کا بُرا حال تو دیکھا نہیں جاتا
ہم جیسوں کو ہنسا نہیں آتا، نہیں آتا
کیوں دُور پڑے پھرتے ہیں، مل جائیں خدارا!
شکل اپنی ہمیں بزم میں دکھلائیں خدارا
اور یہ نہیں، تو آہ سے کہہ دیں کہ نہ آنا
پھر آہ کی حالت کو نہ پوچھیں، نہ ٹھکانا
"ناصر اگر از ہجر بنالد عجبے نیست"
"مہجور زیا راست و پریشاں زدیار ست"

---

۵ یعنی انجمن کی جاتی ہے اور یہ انجمن الاسلام کا جلسہ انھیں دعوت دیتا ہے جو شریک نہیں ہوتے ہیں۔

Marfat.com

رام کہانی

پہلے ہم بچے تھے اک نادان تھے
بے نوا تھے، بے سروسامان تھے
بچپنے کے ہاتھ سے مجبور تھے
رات دن کے کھیل میں مسرور تھے
پھر جوانی آئی تو آئی بہار
خوب دیکھی گردشِ لیل و نہار
بے سروسامانیاں جاتی رہیں
اگلی آنا کانیاں جاتی رہیں
مستیاں سوجھیں، ہوس کی ٹھان لی
ٹھان لی جو کچھ کہ دل میں ٹھان لی
جس نے ٹوکا بے تکلف کہہ دیا
آخرت تو آئے، دیکھا جائے گا
"ساقیا" برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را"
علم سیکھا اور ہی کچھ ہو گئے
رات کے جاگے ہوئے تھے، سو گئے
پھر نہ جاگے عمر بھر خواری ہوئی
قبر میں لیٹے تو بیداری ہوئی!

Marfat.com

ایسی بیداری سے سونا خوب تھا
اور اس سونے پہ رونا خوب تھا
"مردماں را سربسر درخواب داں
گشت بیدار آنکہ او رفت ازجہاں"
ایک ظاہر تھا نتیجا اور بھی
ایسے دیوں نے اڑایا اور بھی
واہ کیا کہنے ہیں چہرہ دیکھیے
رحمتِ حق کا تماشہ دیکھیے
اب تو ہر مسجد کے منبر سج گئے
اور کیا حضرت کے ڈنکے بج گئے
آپ کو کوشش سے یہ رتبہ ملا
لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
مل گئی تقدیر بھی تدبیر سے
آدمی سونا بنا اکسیر سے
ماہرِ ہر علم حضرت ہی تو ہیں
ماحیِ تغییر و بدعت ہی تو ہیں
آپ کو سچوں میں سچا جانیے
جانیے اچھوں کو اچھا جانیے

ایسی باتوں سے بڑھا کبر و غرور
بڑھتے بڑھتے پڑ گئے رستے سے دور
پہلے رحمت تھے تو زحمت ہو گئے
خضر سے گمراہ امت ہو گئے

Marfat.com

ہو گئے سرمستِ صہبائے خودی
بیخودی میں کچھ نہ سُوجھی دور کی
جب ہوائے نفس میں رہنے لگے
آدمی کو آدمی کہنے لگے
خود پرستی کی طرح غفلت بڑھی
خود کو بھولے غیر سے اُلفت بڑھی
کاش ہم دلدار پر رکھتے نظر
"اعتمادے نیست بر علم و ہنر"

جب ہوئی اس ابتدا کی انتہا
ہوگئی اس انتہا کی ابتدا
انگلیاں اٹھیں، تماشا ہوگئے
چار سُو عالم میں رُسوا ہوگئے
ایک نے بڑھ کر کہا: حضرت یہ کیا؟
آپ ہی ہیں ہادیِ امت، یہ کیا؟
خود کو بھولے اور خودی میں آگئے
منھ بھی یوں آئے کہ منھ کی کھا گئے
آپ اپنی ذات سے ماہر نہیں
بات جو مخفی ہے، وہ ظاہر نہیں
"مولوی گشتی و آگاہ نیستی
خود کجا و از کجا و کیستی"
معرفت کیا چیز ہے، فرمایئے!
آپ سمجھے ہیں، تو کچھ سمجھایئے!

Marfat.com

"ایں روا آں ناروا' دانی تو نیک
تو روا یا ناروائی' بیں تو نیک
تو ہمیدانی بجوز دلا بجوز!
خود نمیدانی کہ حوری یا عجوز!"

مرگ کے ظاہر نشاں ہونے لگے
تیر سے، حضرت کماں ہونے لگے
پر نہ سمجھے، آپ کو یہ کیا ہوا
آپ کا کہنا، مرا کہنا ہوا
علم کے دنیا میں جھنڈے گڑ گئے
پھر بھی تو لینے کے دینے پڑ گئے
"صد ہزاراں علم دارد از علوم
جانِ خود رامی ندا ند ایں ظلوم"

داغ دو کھائے ہیں رونا ایک ہے
آنکھ کا ہونا نہ ہونا ایک ہے
"اے بسا عالم ز دانش بے نصیب
حافظِ علم است آں کس نے حبیب"
ہائے سب منطق کا جھگڑا ہیچ ہے
ہیچ ہے مغربی و کبریٰ ہیچ ہے
"عمر در محمول و در موضوع رفت
بے بصیرت عمر در مسموع رفت
زندگی مغربی ہے، کبریٰ ہے ممات

Marfat.com

حدِ اوسط ہے عذابوں سے نجات
رہ گیا باقی نتیجہ "وصلِ دوست"
"ہر دو عالم یک فروغِ روے اوست"

معرفت کے لفظ نے سمجھا دیا
اک خودی گم ہو، تو مل جائے خدا
گھر سے نکلو، شکل دیکھو راہ کی
معرفت ہے نفس سے، اللہ کی
خود کو پہچانو، تو اُس کو جان لو
مان لو، اے آہ! کہنا مان لو

(مخزن، دسمبر ۱۹۰۲ء، بحوالہ ہماری زبان، یکم اگست ۱۹۶۹ء)

Marfat.com

کچھ اور دیکھ لیتے

بیچین کر رہی ہے یہ مختصر کہانی
جب چل دیا لڑکپن اور آگئی جوانی
کچھ اور ہو گیا دل، کچھ اور ہو گئے ہم
کھو کھو کے مل گئے ہم، مل مل کے کھو گئے ہم
کہتے یہ محتسب سے، معذور دار مارا
اک بات تھی: "سکرنا یا ایہا السکارا"
سب سے جدا رہے ہم نقشہ جدا ہی دیکھا
آنکھیں جدھر اٹھائیں، عالم نیا ہی دیکھا
علم و ہنر کے ہاتھوں، ہم باکمال ٹھہرے
ہم ذی جلال ٹھہرے، ہم ذی جمال ٹھہرے
جانا تو کیا نہ جانا، سیکھا تو کیا نہ سیکھا
سب کام ہم نے سیکھے، پر دیکھنا نہ سیکھا

Marfat.com

سرمہ بہت لگایا، چشمہ بہت چڑھایا
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آیا[۵]

ناکامیاب رہنا، تقدیر میں لکھا تھا
کیا خاک دیکھتے ہم، جب دیکھنا نہ آیا

ہم کو ہماری فطرت جلوے دکھا رہی ہے
اک چیز جا رہی ہے، اک چیز آ رہی ہے

بڑھنے لگی ضعیفی، ڈھلنے لگی جوانی
آنے لگا بڑھاپا، ٹلنے لگی جوانی

ہے ہے اصولِ نیچر، آخر کو رنگ لائے
اور مضمحل قویٰ نے رہ رہ کے گل کھلائے

اعضا میں کیا رکھا تھا، ڈھانچے میں کیا دھرا تھا
اک موت کا فرشتہ سر پر کھڑا ہوا تھا

آئے خزاں کے جھونکے، جینے کے گلستاں میں
مرنے کی شکل دیکھی، آئینۂ جہاں میں

پھر خاک میں ملے ہم، یاد آ گیا کندھلنا
قسمت پکار اٹھی: "اب دیکھنا، سنبھلنا"

ہڈی لگی چٹخنے، چھٹنے لگے پسینے
واقع میں عمر بھر کے بدلے لیے زمیں نے

---

۵ میرے سامنے خدنگِ نظر کی وہ جلد ہے جو کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے کتابخانے میں رہی ہے۔ جس شمارے میں یہ نظم شائع ہوئی تھی، اس میں سرخ روشنائی سے یہ شعر یوں بنا دیا گیا ہے۔

سرمے بہت لگائے، چشمے بہت چڑھائے
جو دیکھنے کا حق ہے، وہ دیکھنے میں آئے

یہ اصلاح مولانا آزاد کے قلم سے بھی ہو سکتی ہے اور خود آہ کے بھی، کیونکہ یہ جلد ان دونوں کے پاس رہی ہے۔ (م۔ر)

Marfat.com

آنکھیں جو بند کرلیں، گویا کہ کچھ نہ دیکھا
پایا کہ کچھ نہ پایا، دیکھا کہ کچھ نہ دیکھا
اُف، تن بدن کی رگ رگ رہ رہ کے جل رہی ہے
اور دیکھنے کی حسرت دل میں مچل رہی ہے
سینے میں رہ گیا دل، دل میں رہی تمنا
"کچھ اور دیکھ لیتے،" یہ رہ گئی تمنا
دنیا میں ہم نے دیکھا سب کچھ، مگر نہ دیکھا
کیا یہ بھی دیکھنا ہے، جو دیکھ کر نہ دیکھا

(خدنگِ نظر، اگست، ۱۹۰۲ء)

Marfat.com

رباعیات

یہ آپ سے کیا کہوں کہ اب کیسا ہوں
اللہ کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں
ہوں سلسلِ بول و دردِ سر سے رنجور
رنجورؔ کے اصرار سے یاں آیا ہوں

بیداریِ شب سے تپ بڑھا کرتی ہے
اور فکر یہ تکلیف سوا کرتی ہے
سب کچھ مانا، مگر کہاں تک انکار
ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے

[اُردو ادب (آزاد نمبر) : ۲۹۲]

فردیات

ہم نہ کہتے کہ یوں نہ چلنے دو — تم اگر بات کے دھنی رہتے

زشت رُو کو حسیں سے کیا نسبت — آسماں کو زمیں سے کیا نسبت

ہنس ہنس کے داغہائے جگر دیکھتے بھی ہیں
اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ شوقِ چمن نہیں

[اُردو ادب (آزاد نمبر) : ۴۴]

ؔ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور مراد ہیں۔

Marfat.com

قطعات

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچوائیں — نئے طریق سے اظہارِ رسم و راہ کریں
ہمارے پاس بھی بھیجیں اُسے شرارت سے — کہ حال رشک سے رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہے، اس پہ زبانی پیام بھی آئے — ہمارے سر کی قسم ہے اُنھیں، جو آہ کریں

(ماخوذ از ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ بٹ)

ہر سمت سے آرہی ہے آواز — اللہ بھلا، بشر بُرے ہیں
اللہ! ہماری شرم رکھ لے — تیرے ہی تو ہیں، اگر بُرے ہیں

اسراف کی دھوم ہر کہیں ہے — پابندیِ رسم دلنشیں ہے
اور اس کا نہیں خیال دل میں — اب گھر میں ہمارے کچھ نہیں ہے

پیری میں رو رہا ہے جوانی کو پیر مرد
یعنی وہ اگلے رنگ کے اب کھیل ہی نہیں
اک خواب تھا زمانۂ ماضی کی چاہتیں
اگلا سا اب ملاپ نہیں، میل ہی نہیں
پہلو میں دل ہے، دل میں امنگوں کا کال ہے
کیونکر جلے چراغ کہ اب تیل ہی نہیں

پی کے کرنا مذمتیں مے کی — تو نے واعظ! مری سنی ہی نہیں
جس میں "حق الیقین" کی بُو ہو — ایسی تو نے کبھی کہی ہی نہیں
تیری باتوں میں خاک ہو تاثیر — ہائے کمبخت! تو نے پی ہی نہیں

Marfat.com

رات کٹتی ہے بہر صورت فقیر و شاہ کی
اُس نے ہنستے کاٹ دی اور اُس نے روتے کاٹ دی
گو کہ دن کا جاگنا بھی غفلتوں کے ساتھ ہے
پر ہمیں دیکھو کہ ہم نے رات سوتے کاٹ دی

یہ تم کو کیا ہوا، اے اسیرانِ ہمصفیر!
اُٹھتے نہیں ہلائے سے بھی، سو گئے ہو کیا؟
ہم تو وہی ہیں اگلے تمھارے نیاز مند
چُپ چاپ کیوں ہو، ہم سے خفا ہو گئے ہو کیا؟

آرام کی چیز دل ہی سے میسّر نہیں آرام
دنیا میں ہر اک طرح سے مشکل ہے بشر کو
تھک تھک کے رہے جاتے ہیں کیوں راہِ طلب میں
کیا سر پہ کوئی لے کے چلے پائے سفر کو

شاعری اصلاً غلط گوئی نہیں
جھوٹ کہنا شاعروں کا کام ہے
سب انھیں گندوں کے گندے ہیں خیال
شاعروں سے شاعری بدنام ہے

(مخزن، اگست، ۱۹۰۴ء)

Marfat.com

قطعاتِ تاریخ

انتقالِ پُرملال ملک الشعرا جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی نور اللہ مرقدہ استادِ نواب رامپور خلد آشیاں

"فات ہیہات امیرُ الالقاب"

۱۳۱۸ھ

برزمیں رفت کانِ علم و ادب قُرصِ خورشید در سیاہی شد
آہِ غمگیں نوشت سالِ وفات "وائے مفتی امیر راہی شد"

۱۳۱۸ھ

"قدسی صفات سوے ملکِ بقا شد"

۱۳۱۸ھ

آہ، سرتاجِ بزمِ شعر و سخن! آہ، ذی علم مفتی و منشی
مل گئیں خاک میں امیدیں سب ہائے بیوقت تو نے رحلت کی
بلبلِ طبع بول اٹھی پہِ سال "آہ، باغِ سخن میں آگ لگی"

۱۹۰۰ء

صاحبِ وقار بخلد رسید

۱۳۱۸ھ

طوطیِ باغِ سخن استادِ دہر حضرتِ مفتی امیر لکھنوی
فی الحقیقت علم کے بدرِ منیر واقعی مہر لیاقت واقعی
رشکِ آتش، عزت افزائے اسیر فخرِ ناسخ، فخرِ میر و مصحفی

Marfat.com

ان کو ہر اک نظم میں تھی دستگاہ — کیا رباعی، کیا غزل، کیا مثنوی
تھے قصیدے میں ہوس سے بھی زیاد — غیرتِ عُرفی کہوں یا انوری
کیا بجھا ان کا چراغِ زندگی — شمعِ بزمِ شاعری ہی بجھ گئی

آہ! لکھو مصرعِ سالِ وفات
"ہو گیا تاراج ملکِ شاعری"
۱۳۱۸ھ

ایک جاتا ہے، ایک آتا ہے — ہائے، دنیا مقامِ عبرت ہے
کہیں ماتم، کہیں ہے بزمِ نشاط — کہیں غم ہے، کہیں مسرت ہے
فاسمعوا کُلَّ مَنْ عَلَیْھَا فَان — ایک اللہ کو قدامت ہے
آہ، منشی امیر احمد، آہ — تیرا مرنا بھی اک قیامت ہے
سوز ہے دل میں، لب پہ نالہ و آہ — ایسے ماتم کی کس میں طاقت ہے
پے تاریخ سنگِ تربت پر — لکھ دو: "از حد خدا کی رحمت ہے"

۱۳۱۸ھ

(خدنگِ نظر، نومبر، ۱۹۰۰ء)

باہتمامِ نظر یافت ایں چہ حسنِ قبول
بلند شد ز فلک پایۂ خدنگِ نظر
دعایۂ پے آغازِ سال گفتم، آہ!
کہ باد بر سرِ ما، سایۂ خدنگِ نظر

۱۹۰۰ء

Marfat.com

قطعۂ تاریخ

سالِ نو "خدنگِ نظر"

مہِ چار دہ در بزم تاختہ — مکانم مگر آسماں ساختہ
چہ محبوب، محبوبِ محبوبؔ[1] هم — چہ مطلوب، مطلوبِ مطلوب هم
بگو، چوں نباشد دلم شاد شاد — حق او را چہا حسنِ جاوید داد
بہر طور زحمت کشیدن چہ سود — کہ گلہا ببیں، خار چیدن چہ سود
زنامِ دل آویز پرسی اگر — بلے گویمت، کو "خدنگِ نظر"
چہ گویم ز تعریفِ او یَلّلی — چہ خوانم ز توصیفِ او یَلّلی
"خدنگِ نظر" گلشنِ بیخزاں — کہ اشعارِ گلہا "نظرؔ"[2] باغباں
"خدنگِ نظر" اے خدنگِ نظر! — دعا گوے تو آہِ شام و سحر
بدل نیک دانم کہ شد سالِ نو — زمن نغمۂ شادمانی شنو
چہ از بہرِ تفصیل اجمال شد — "خدنگِ نظر دیدنی" سال شد
۱۹۰۲ء
دگر مصرعِ سال ازاں خوبتر — کہ محبوبِ زیبا خدنگِ نظر
۱۹۰۲ء

("خدنگِ نظر" فروری ۱۹۰۲ء)

۱؎ آصف جاہ ششم میر محبوب علی خان نظام حیدرآباد کی طرف اشارہ ہے۔

۲؎ مدیر "خدنگِ نظر" منشی نوبت رائے نظر

Marfat.com

قطعۂ تاریخ

جشنِ تاجپوشی اعلیٰ حضرت شاہِ انگلستان

شہنشاہِ ہندوستان خلد اللہ ملکہٗ

در صنعتِ حروفِ منقوط

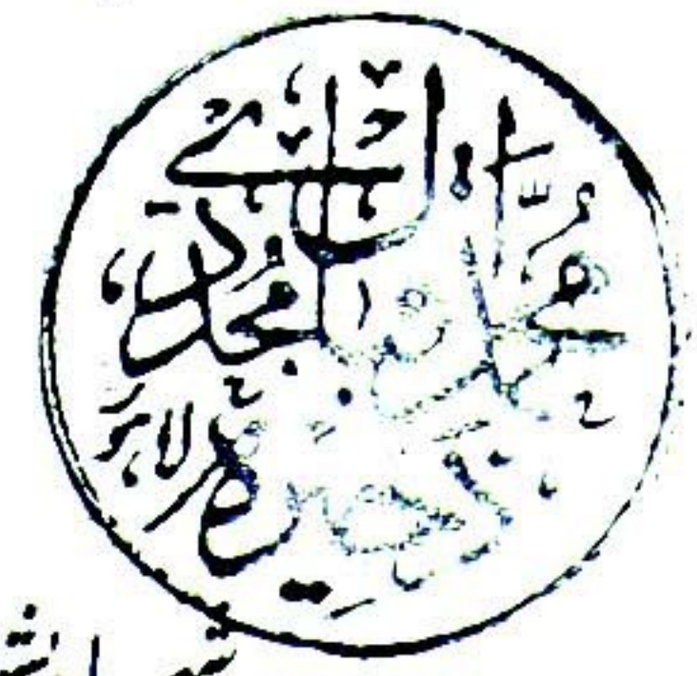

شہا بشو محوِ بادہ نوشی بخیر شد جشنِ تاجپوشی
بعیش کوشی بعیش کاری مبارک ایں تخت و تاج بادا
زرنج رستی کہ چست و چالاکی بذوق و مستی، بجام و ساقی
بلطفِ ہستی بکامگاری مبارک ایں تخت و تاج بادا
بحرفِ منقوط سال گفتم ببیں چہ درہائے نغز سُفتم
عجیب رسمے و ملکداری مبارک ایں تخت و تاج بادا

۱۹۰۲ھ

خسروا! تو باحترام بماں برہمہ احترامِ تو ماند
نام تو وردِ ہمہ صغیر و کبیر تا جہانست نامِ تو ماند

آہ گفت ایں دعائیہ مصرع

"عمر و دولت بکامِ تو ماند"

۱۳۲۰ھ

Marfat.com

در صنعتِ تخرجہ

اتفاقاً کل جو آنکھیں بند کیں
تخت پر دیکھا اسی ججاہ کو
آہ نے اُٹھ کر دعائیہ کہا
"تاجپوشی راس آئے شاہ کو"

(۱۳۲۶-۶=۱۳۲۰ھ)

قطعاتِ تاریخ سالِ پنجم خدنگِ نظر، لکھنؤ

خوشا نظم و نثرِ فصیحانِ ہند   زہے اہتمامِ جنابِ نظر
پئے سالِ پنجم دلم گفت: آہ   کہ بستاں نمودہ عجب خوبتر
(۱۹۰۱ء)

ولہٗ

از تازہ تریں گلہائے مضامیں   غنچۂ دل بشگفت ز شادی
آہ! بگفتم مصرعِ سالش   "باغِ سخن گلدستۂ خوبی"
(۱۹۰۱ء)

(خدنگِ نظر، فروری ۱۹۰۱ء)

Marfat.com

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	٦٠/=
باتیں کچھ سریلی سی	(سوانح ماہرین موسیقی)	داؤد رہبر	٣٦/=
خسرو نامہ	(تحقیق)	مجیب رضوی	٢١/=
تعلیم و تربیت اور والدین	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	٥١/=
کولمبس کے دیس میں	(سفرنامہ)	جگن ناتھ آزاد	٤٥/=
پتھر بوئے چمن ...	(ڈرامے)	عمیق حنفی	٤٥/=
ریت کی دیواریں	(ناول)	رفعت سروش	٢١/=
منجمد بادل	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	٣٢/=
دائروں میں پھیلی لکیر	(شعری مجموعہ)	کشور ناہید	٣٠/=
آنکھ میں سمندر	(شعری مجموعہ)	زاہد ڈار	٣٠/=
تذکرہ	(ناول)	انتظار حسین	٥٤/=
ذرے کی کہانی	(سائنس)	مہدی جعفر	٢١/=
حیات جامی	(سوانح)	مولانا اسلم جیراج پوری	١٢/=
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات	(خطبہ)	پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی	٨/=
نقشِ ذاکر	(مضامین)	مرتب: عبدالحق خاں	٥١/=
ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ)	(تاریخ)	شمس الرحمٰن محسنی	٥٠/=
دنیا کے بڑے مذہب	(علمی)	عماد الحسن آزاد فاروقی	٨٥/=
تحلیل نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین	(مضامین)	ڈاکٹر سلامت اللہ	٣٥/=
تعلیم اور رہنمائی	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	٣٥/=
ہم اردو کیسے پڑھائیں	(تعلیم)	معین الدین	١٥/=
یادوں کا اجالا	(آپ بیتی) بھگوان سنگھ	مترجم تسنیم حنفی	٤٠/=
ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات	(مضامین)	مرتبہ: عماد الحسن آزاد فاروقی	٤٠/=
پشکن کے دیس میں	(سفرنامہ)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	٢٥/=
آنکھ اور خواب کے درمیان	(شعری مجموعہ)	ندا فاضلی	٢١/=
سدا بہار چاندنی	(افسانے)	رام لعل	٣٠/=
دل دریا	(افسانے)	سُرون کمار ورما	٢٥/=
رانگ نمبر	(انشائیے)	شفیقہ فرحت	١٦/=
رات کے مسافر	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: انور سجاد	٢٨/=
زوال کا عروج	(ڈراما) برخت	مترجم انور عظیم	٣٦/=
اثبات و نفی	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمٰن فاروقی	٤٠/=
مالک رام ـ ایک مطالعہ	(مجموعۂ مضامین)	مرتبہ: علی جواد زیدی	٥٠/=
فی الحال	(مزاحیہ مضامین)	یوسف ناظم	١٨/=
حرف حرف روشنی	(شعری مجموعہ)	حمایت علی شاعر	٣٥/=
فرار	(ناول)	ظفر پیامی	٢٠/=
تین چہرے تین آوازیں	(افسانے)	صالحہ عابد حسین	١٨/=
نقد حرف	(تنقیدی مضامین)	پروفیسر ممتاز حسین	٤٨/=
گدازِ شب	(شعری مجموعہ)	معین احسن جذبی	٣٠/=
سرسید کی تعلیمی تحریک (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد)	(روداد)	اختر الواسع	٢٥/=
گفتار غالب	(مضامین)	مالک رام	٤٨/=

مطبع: سرلی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۲

Marfat.com